تذکرہ شعرائے اردو سانگھڑ

مرتب
ملک غلام مصطفیٰ تبسم

تذکرہ شعرائے اردو سانگھڑ

ملک غلام مصطفیٰ تبسم

حلقۂ یارانِ سخن (ٹنڈو آدم) سندھ

ضابطہ

کتاب	:	تذکرۂ شعرائے اردو سانگھڑ
مؤلف	:	ملک غلام مصطفیٰ تبسم
بار اول	:	فروری ۲۰۱۴ء
ناشران	:	محمد اطہر مصطفیٰ، محمد اظہر مصطفیٰ، محمد اسد مصطفیٰ
کمپوزنگ	:	محمد مرتضیٰ میو، غلام رسول سوں
پروف خوانی میں معاونت	:	تحریم مصطفیٰ، مہرین مصطفیٰ
سرورق مصوری	:	یوسف شیخ
سرورق گرافکس	:	محمد عامر
پیش کش	:	حلقۂ یاران سخن (ٹنڈو آدم) سندھ
مطبع	:	شان پرنٹنگ پریس حیدرآباد Ph: 2720654
قیمت	:	۳۵۰ روپے

تقسیم کار

ظفر بخاری نیوز ایجنسی سانگھڑ

شاہ لطیف فوٹو اسٹیٹ، لوہار گلی، ٹنڈو آدم

فائن بک ڈپو، اقبال روڈ، ٹنڈو آدم

ماروی بک ڈپو، جناح روڈ ٹنڈو آدم

رابطہ موبائل 0333-2881303

Email:tabassum_tabassum2000@yahoo.com

ضلع سانگھڑ کے مرحوم شعرأ کے نام

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے۔
(آتش)

○

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے
جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

مجھے اپنی چادر میں یوں ڈھانپ لو
زمیں آسماں کچھ دکھائی نہ دے

میں اشکوں سے نامِ محمدؐ لکھوں
قلم چھین لے، روشنائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

(بشیر بدر)

فہرست

پیش گفتار

اللہ رب العزت کے بے شمار احسانات میں سے ایک عظیم احسان، اس بندۂ حقیر پر یہ بھی ہے کہ اُس نے مجھے علم وادب سے محبت کرنے والا دل عطا فرمایا اور شاعری کے وصف سے سرفراز کیا۔ شہرِ علم وادب میں قدم رکھنے کے بعد سے، میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنے شہر اور ضلع کے صاحبانِ علم وادب کی حیات ہائے گم گشتہ اور تخلیقات کو منظر عام پر لاؤں۔ تذکرہ شعرائے اردو ساگھڑ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۹۹۶ء میں ایم اے اردو کی ضرورت کے تحت لکھا گیا جسے اب ضمیمے کے اضافے کے ساتھ شایع کیا جارہا ہے۔ اس کی اشاعت میں یقیناً کافی تاخیر ہوئی ہے، اس تاخیر کی بظاہر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیوں کہ اس دوران بیسیوں مرتبہ ہمت باندھی، ارادہ کیا لیکن یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی، اس میں کچھ تو وسائل کی کمی آڑے آتی رہی اور کچھ دخل میری غیر مستقل مزاجی اور مشاعرے بازی کو بھی حاصل ہے۔ جس کی بنا پر یہ کام مسلسل تعطل کا شکار ہوا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اشاعت میں یہ تاخیر یا تعطل بھی بعید از مصلحت نہیں تھا، ہر کام کے ہونے کا ایک وقت معین ہوتا ہے، انسان کی کیا مجال کہ وہ اُسے اُس کے معینہ وقت سے پہلے سرانجام دے سکے۔

کسی بھی کتاب کی اشاعت کے وقت مصنف یا مؤلف کتاب کی اہمیت وافادیت کے حوالے سے کوئی نہ کوئی دعوا ضرور رکھتا ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ مجھے ایسا کوئی دعوا ہرگز نہیں ہے البتہ اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ اس تذکرے کی اشاعت کے بعد ضلع ساگھڑ کی سو سالہ ادبی تاریخ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی ہے۔

جو یقیناً مستقبل کے محققین اور مؤرخین کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوگی انشاء اللہ۔

ضلع سانگھڑ:

سانگھڑ کو ضلع کا درجہ ستمبر ۱۹۵۳ء میں حاصل ہوا۔ اس سے قبل یہ علاقہ انتظامی لحاظ سے نواب شاہ اور تھرپارکر اضلاع میں شامل تھا۔ موجودہ وقت میں ضلع سانگھڑ، چھ تحصیلوں ٹنڈو آدم، شہداد پور، جام نواز علی، کھپرو، سنجھورو اور سانگھڑ پر مشتمل ہے، تاہم ٹنڈو آدم، شہداد پور اور سانگھڑ کا شمار سندھ کے چند قدرے ترقی یافتہ شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ تینوں شہر ضلع میں اردو شاعری کے حوالے سے بھی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آنے والے شعرائے کرام نے ان شہروں میں اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہاں پاک ہند مشاعروں کے علاوہ سندھی اردو مشاعروں کی طرح ڈالی جس سے شاعری اور ادب کے ساتھ ساتھ یہاں بسنے والی مختلف لسانی اکائیوں کے درمیان ہم آہنگی اور رواداری کو فروغ حاصل ہوا۔ بلاشبہ اس دور کو سانگھڑ کی ادبی تاریخ کے روشن دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ موجودہ وقت میں سانگھڑ کے ان شہروں میں، ادب کی صورت حال اب ایسی نہیں ہے۔ زمینِ شعر و ادب پھر سے بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ اس وقت سانگھڑ شہر میں "حلقۂ سفیرانِ ادب" (روحِ رواں غلام مصطفیٰ راز)، شہداد پور میں "بزمِ ادب دائرۂ مہدویہ" (روحِ رواں پیر میران شہاب یداللّٰہی) جب کہ ٹنڈو آدم میں "حلقۂ یارانِ سخن" تین ایسی ادبی انجمنیں ہیں جو وقفے وقفے سے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں پتھر پھینکتی رہتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ:

ع　　رنگ لائے گی ہماری "سنگ باری" ایک دن

اظہارِ تشکر:

آخر میں، میں خود پر لازم سمجھتا ہوں کہ ان احباب کا شکریہ ادا کروں جن کے تعاون اور مشورے کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھی۔ سب سے پہلے اپنے خاندان کے افراد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب کی مصروفیات کے پیشِ نظر میری کوتاہیوں سے صرفِ نظر کیا، مجھے احساس ہے کہ میں نے اپنا وہ وقت بھی اس کتاب کی نذر کیا جو خاندان کی ذمہ داریوں اور فرائض کے لیے وقف تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید جاوید اقبال، پروفیسر مرزا سلیم بیگ، اختر سعیدی، عطاء اللہ خان، آفتاب عالم قریشی، عاصم صدیقی، شوکت علی شوکت، غلام مصطفیٰ راز، ابو سرمد، مختار احمد ماکا، عبدالرزاق ساغر، یونس کھنڈو، ڈاکٹر عبدالوقار ساغر، کامران عشرت، غلام رسول سموں، محمد مرتضیٰ میو اور امام بخش بھرگڑی کا بھی سپاس گزار ہوں کہ میرے ان محترم

دوستوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں خصوصی ایثار کا مظاہرہ کیا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ علاوہ ازیں ٹنڈوآدم کے یگانۂ روزگار آرٹسٹ یوسف شیخ (گودھرا) کا خصوصی طور پر احسان مند ہوں کہ انہوں نے کتاب کا سرورق تیار کیا۔ یوسف شیخ کے لیے بس اتنا ہی کہوں گا کہ وہ ایک بڑا آرٹسٹ ہے جو ایک ایسے چھوٹے شہر میں سانس لے رہا ہے جہاں چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو کوئی قدرداں نہیں ملتا۔

۲۰ر فروری ۲۰۱۴ء

ملک غلام مصطفیٰ انجم
لیکچرر شعبۂ اردو
گورنمنٹ نیو علی گوٹھ ڈگری کالج ٹنڈوآدم

پیش لفظ

ملک غلام مصطفیٰ تبسم خلد و آدم کی نہایت معتبر ادبی شخصیت ہیں۔ یہ اقبال انھوں نے ادب کی سلطنت پر شب خون مار کر حاصل نہیں کیا بل کہ اس کے پیچھے اُن کی شب و روز کی وہ محنت ہے جو وہ برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس ضمن میں نہ تو انھیں صلے کی تمنا ہے اور نہ ستائش کی پروا ہے۔ گو بہ طور شاعر واہ کے لفظ سے انھیں فطری طور پر ایک طرح کی رغبت ہونی چاہیے کہ بہ قول حضرت امیر مینائی:

شاعر کو دل سے بھاتی ہے تحسین شعر امیرؔ
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

مگر یہ ان معنوں میں عجیب و غریب آدمی ہیں کہ اپنی تحسین کے بہ جائے اس فکر میں دُبلے ہوئے جا رہے ہیں کہ ضلع ساگھڑ کے کسی اہل قلم کے کوائف اور اس کا نمونۂ کلام محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے۔ گو کہ یہ کام روز اول سے ہی شعرا نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ میر و مصحفی کے تذکرے تو آپ کو یاد ہی ہوں گے۔ انھی سے تذکرہ نویسی کی بنیاد پڑی اور وہ تاریخ ساز تذکرے سامنے آئے جن کی مدد سے ادبی تاریخ ترتیب دی جا سکی۔ اس سلسلے میں آزاد کی "آبِ حیات" کو نمایاں اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس کے بعد تذکرے کا ملا تاریخ میں بدل گئے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ تذکرے آج بھی لکھے جا رہے ہیں اور اسی آب و تاب سے لکھے جا رہے ہیں۔ "تذکرۂ شعرائے اردو ساگھڑ" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ گو کہ مرتب کا اپنا بیان ہے کہ یہ تذکرہ انھوں نے صرف امتحانی ضرورت کے پیش نظر مرتب کیا، لیکن تذکرے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جس دیدہ ریزی کا اہتمام انھوں نے کیا ہے وہ امتحانی ضرورت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس تذکرے کو دیکھ کر یہ خوش گوار حیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ تبسم کے اندر ایک خوش فکر شاعر کے شانہ بہ شانہ ایک نہایت محنتی محقق بھی سانس لے رہا ہے۔ ان کی اسی ریاضت کے پیش نظر مجھے امید ہو رہی ہے کہ پہلے یہ تذکرہ زیور طباعت سے آراستہ ہوگا اور پھر

اس کے فاضل مؤلف اسے تاریخ کا جامہ پہنائیں گے۔ اور اس تاریخ کے آئینے میں اندرونِ سندھ کا ادب آئینہ خوانی کرے گا۔ اگر ایسا ہوا تو یوں سمجھئے کہ حکیم عبدالحئی (م: ۱۹۲۳ء) اور ان کی معرکہ آرا تالیف ''گلِ رعنا'' (۱۹۲۳ء) کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ کیوں کہ اس تذکرے کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اس نے اوّلاً بیاض کے روپ میں جنم لیا اور بعد میں اس کے مؤلف نے اسے تذکرے کی شکل دی، اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۲ء میں یہی بیاض ادبی تاریخ کی حیثیت سے سامنے آئی۔ اس ضمن میں مجھے بجا طور پر خوش گمانی لاحق ہے کہ جناب غلام مصطفیٰ تبسم کا یہ تذکرہ اس منزل سے گزرنے کے بعد ادبی تاریخ کے روپ میں ظاہر ہوگا۔ کیوں کہ یہاں تک پہنچنے کے بعد وہی کون سی دور ہے۔

اس تذکرے میں رواجِ زمانہ کے مطابق مؤلف نے شعراء کا اندراج تخلص کی ابجائی ترتیب کے مطابق کیا ہے۔ ابتدا میں مختصر سوانحی کوائف ہیں، اس کے بعد نمونۂ کلام درج کیا ہے۔ تمام شعراء کو دو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح ضلع سانگھڑ سے تعلق رکھنے والے ایک سو چوبیس (۱۲۴) شعراء و شاعرات، ملک غلام مصطفیٰ تبسم کے اس تذکرے کی زینت ہیں۔ ان میں سے زیادہ تعداد اُن شعرائے کرام کی ہے جو اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ کر راہیِ ملکِ عدم ہو چکے ہیں۔ مزید ستم یہ کہ چند ایک کے سوا کسی کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس صورتِ حال میں اُن کے لواحقین کو تلاش کر کے انھیں اس تذکرے کی اہمیت سے آگاہ کرنا اور انھیں آمادہ کرنا کہ وہ اس علمی کام میں تعاون کرتے ہوئے مرحوم کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام سے مؤلف کو آگاہ کریں۔ بہت مشکل کام ہے۔ اس امتحان سے تبسم کس طرح سے گزرے یہ وہی بہتر جانتے ہیں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کے صبر آزما علمی کام کی داد وہی لوگ بہتر طور پر دے سکتے ہیں جو اس نوع کے امتحان سے کبھی گزرے ہوں۔

یہ مقالہ ۱۹۹۶ء میں اُس وقت کی صدرِ شعبہ اور پروفیسر فہمیدہ شیخ صاحبہ کی نگرانی میں لکھا گیا۔ اس کی اشاعت کی نوبت اب یعنی فروری ۲۰۱۴ء میں آئی ہے۔ اس لیے معلومات کو از سرِ نو اپڈیٹ کرنے کے بعد ملک غلام مصطفیٰ تبسم نے بعد میں حاصل شدہ معلومات کو ضمیمے کا اضافہ کر کے اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا کہ انھوں نے اس مقالے کو بہتر اور مفیدِ عام بنانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

پروفیسر مرزا سلیم بیگ
صدر، شعبۂ اردو
جامعہ سندھ، جام شورو

دیباچہ

رب کائنات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج سے چند ماہ قبل جو کام میرے ذمے سونپا گیا تھا بہ حسن وخوبی انجام پذیر ہوا۔ میرے لیے مقالہ ایک نیا تجربہ تھا جس میں کامیاب ہونا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا، لکھنے لکھانے کا شوق اسکول کے زمانے سے ہے، ابتدا میں استاد مطلوب طالب کی رہنمائی اور اصلاح سے مختلف جرائد میں بچوں کے لیے کہانیاں اور افسانے تحریر کیے بعد ازاں ٹنڈو آدم سے بچوں کے لیے رسالہ ماہ نامہ ''بیداری'' اور ہفت روزہ اخبار ''تنہا'' بھی جاری کیے جو کچھ عرصے تک شایع ہوتے رہے پھر نامساعد حالات کے پیش نظر بند کر دیے گئے، اسی دوران محترم چوہدری علی اصغر آرائیں کی زیر نگرانی ایک کتاب بعنوان ''ماں'' تالیف کی جو ہنوز منتظر اشاعت ہے[۱]، آج کل جو ذوقِ شعر گوئی کروٹیں بدل رہا ہے دیکھیے یہ جنوں کیا رنگ لاتا ہے۔ پس اسی جنون اور ذوقِ شعر وادب نے ایم۔ اے اُردو کے دوران مقالہ لکھنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ محترم سید جاوید اقبال (لیکچرار جامعۂ سندھ[۲]) اور محترمہ فہمیدہ شیخ (سابق صدر شعبۂ اُردو، جامعۂ سندھ) نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ محترم جناب سید جاوید اقبال نے مقالے کا عنوان تجویز فرمایا اور محترمہ فہمیدہ شیخ صاحبہ نگراں مقرر ہوئیں۔ ابتدا میں یہ کام انتہائی دشوار محسوس ہوا مگر محترمہ فہمیدہ شیخ صاحبہ کے تعاون اور محترم سید جاوید اقبال صاحب کے مشوروں اور ان کی تجاویز نے بہت سی آسانیاں پیدا کر دیں۔ محترم سید جاوید اقبال کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی، میں نے جب چاہا یونیورسٹی یا گھر پہنچ کر انھیں زحمت دی اور ان کا حسنِ ظرف دیکھیے کہ ہر بار مسکراتے ہوئے ملے اور انتہائی مصروف ہونے کے باوجود وقت دیا۔ اسی طرح اس بات کا بھی معترف ہوں کہ اگر میری نگراں کا تعاون شاملِ حال نہ ہوتا تو شاید میں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا۔

ضلع سانگھڑ کے بعض شہر بالخصوص ٹنڈو آدم، شہداد پور اور سانگھڑ قیام پاکستان کے بعد سے اسّی کی دہائی تک شعر وادب کا گہوارہ رہے اس دوران یہاں کل پاکستان مشاعروں کے علاوہ ایک ''پاک و ہند مشاعرہ'' بھی منعقد ہوا، لیکن اسّی کے بعد سے یہاں کی ادبی سرگرمیاں یکا یک ماند پڑنا شروع ہو گئیں اور رفتہ رفتہ نہ ہونے کے برابر رہ گئیں، صرف شہداد پور میں ''المشرق آرٹ اکیڈمی'' کے زیر اہتمام سال چھ ماہ بعد

---

[۱] ۱۹۹۹ء میں ''جنت جس کے قدموں تلے'' کے عنوان سے شایع ہو چکی۔

[۲] حال، ڈین آف فیکلٹی آف آرٹس۔

کوئی نہ کوئی ادبی نشست یا مشاعرے کی محفل ہو جاتی ہے[1] اسی طرح چند ماہ قبل ٹنڈو آدم میں اختر سعیدی کی تحریک اور احقر کی کوششوں سے ایک ادبی تنظیم "حلقۂ یارانِ سخن" کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت حال ہی میں ایک تنقیدی نشست اور دو ایک مشاعرے منعقد ہوئے جن میں حیدرآباد، میرپورخاص اور شہدادپور کے شعرائے نے بھی شرکت فرمائی۔ اگر اہلِ ذوق حضرات کا تعاون شاملِ حال رہا تو یہ تنظیم شعر و ادب کے فروغ کے لیے خاطر خواہ کوششیں کرے گی۔[2]

چوں کہ ایک مدت سے یہاں ادبی سرگرمیاں مفقود ہو چکی تھیں چناں چہ شعرائے سے رابطہ کرنے اور ان کے کوائف جمع کرنے کے لیے انتہائی صبر آزما اور تکلیف دہ مراحل سے گذرنا پڑا زیادہ تر شعرائے نے جی کھول کر تعاون کیا، چند ایسے شعرائے بھی سابقہ پڑا جو اپنے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہ تھے مگر ان سے بار بار مل کر اور کرید کرید کر اپنی ضرورت پوری کی گئی۔ حتی الوسع کوشش کی گئی کہ شعرأ کے سرسری تذکرے کے بجائے ان کی زندگی کا مکمل احاطہ کیا جا سکے تاکہ یہ مقالہ تذکرے کا تذکرہ اور تاریخ کی تاریخ ثابت ہو۔ اپنی اس ادنیٰ سی کوشش میں، میں کہاں تک کامیاب ہوا اس کا فیصلہ سخن حضرات اور قارئین پر چھوڑتا ہوں، البتہ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مقالہ کسی محقق یا ادیب کے قلم کا شاہکار نہیں بلکہ ایم۔اے اردو کے ایک طالب علم کی محنتِ شاقہ اور مہینوں کی عرق ریزی کا ثمر ہے جس کے لیے کسی قسم کی ستائش اور صلے کا مستحق ہرگز نہیں بس بارگاہِ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ میری اس ادنیٰ سی کوشش کو قبول فرمائے اور مجھے اردو ادب کی مزید خدمت کرنے کی سعی و توفیق مرحمت فرمائے۔

آخر میں ان تمام کرم فرماؤں اور دوستوں بالخصوص محترم ڈاکٹر عزیز انصاری، محترم قمرؔ انصاری، محترمہ سعیدہ محمود سعیدہؔ (مقبل سعید خان)، محترم فاضل حیدی، محترم صغیر راجپوت، برادرم سرور احمد سرورؔ، برادرم اخترؔ سعیدی اور برادرم سید انور جاوید ہاشمی کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ جن کا مخلصانہ تعاون شاملِ حال رہا اور ان تمام صاحبان نے باوجود مصروفیات کے وقت دے کر صحیح معنوں میں ادب دوستی کا ثبوت دیا۔

۲۹ر جنوری ۱۹۹۶ء

ملک غلام مصطفیٰ انجم

---

[1] فاضل حیدی کے انتقال کے بعد ڈاکٹر رحمٰن دانش اس کے نئے صدر مقرر ہوئے تاہم یہ تنظیم اب غیر فعال ہو چکی ہے۔

[2] اس وقت یہ تنظیم سندھ کی ایک فعال ادبی انجمن ہے۔

باب اوّل

بوئے گل

ہاں، دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف، اے گردشِ ایام تو
(اقبال)

تمہید

اس باب میں کل ۳۰ مرحوم شعراء کا تذکرہ اور کلام ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی نہ کبھی میں مل سکا اور نہ ہی انہیں کبھی دیکھا۔ ۱۹۹۶ء میں جب اس تذکرے پر کام شروع کیا تب ان میں سے کوئی ایک بھی اس دنیا میں موجود نہیں تھا، چناں چہ ان کے بارے میں معلومات کے حصول کے لیے کافی تگ و دو کرنی پڑی۔ ان میں زیادہ تر وہ شعراء ہیں جو قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے ضلع سانگھڑ کے مختلف شہروں خصوصاً ٹنڈو آدم، شہداد پور اور سانگھڑ میں آباد ہوئے اور یہاں فروغ شعر و ادب میں کار ہائے نمایاں انجام دیے۔ چند ایک ایسے شعراء بھی ہیں جن کا بنیادی حوالہ اگر چہ سندھی شاعری ہے تاہم اردو میں طبع آزمائی کی بنا پر انہیں بھی تذکرہ میں شامل کیا گیا ہے۔

اس باب میں شامل زیادہ تر شعراء کا مجموعۂ کلام یا انتخاب کبھی شایع نہیں ہو سکا، یہی وجہ ہے کہ وہ شہرت اور نام وری سے محروم رہے تاہم کچھ شعراء، جو بعد ازاں ترک سکونت کر کے کراچی یا ملک کے دیگر شہروں میں جا بسے تھے انہوں نے کسی حد تک ادبی حلقوں میں نام پیدا کیا، اور جو آخر تک یہیں ٹھہرے رہے ان کے حصے میں گم نامی آئی۔

اختر لکھنوی

۱۹۰۳ء میں محلہ داؤد پور لکھنؤ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ منشی فاضل اور دبیر کامل کے امتحانات پاس کیے، لکھنؤ کے کسی اسکول میں کچھ عرصہ معلم بھی رہے، پھر انڈین آرمی میں بھرتی ہو گئے، قیام پاکستان کے بعد شہداد پور آئے اور محمدی کاٹن فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ یہاں تادم مرگ بحیثیت منیجر ملازمت کرتے رہے۔

لکھنؤ شہر کے ادبی ماحول کا طبیعت پر اثر پڑا۔ محشر لکھنوی جیسے بلند پایہ شاعر سے شرف تلمذ نصیب ہوا، لکھنؤ کی ادبی محافل اور مشاعروں میں بصد شوق شریک ہوتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد شہداد پور اور قریبی شہروں کے مشاعرے پڑھا کرتے تھے، نبی پاک ﷺ اور اہلِ بیتؑ کی مدح میں بہت کچھ کہا، غزلیات میں بھی انسان دوستی اور حب الوطنی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

نواب خاندان سے تعلق کے باعث نازک مزاج تھے۔ لکھنؤ والوں کا رکھ رکھاؤ نمایاں تھا۔ لحاظ، مروت، احسان مندی، رواداری، شرافت، راست گوئی اور دینداری طبیعت کا خاصا تھی، ہندوستان کے دگرگوں حالات کے سبب نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا، خلاف مزاج ملازمت بھی کی بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ حالات سے مکمل طور پر سمجھوتہ کرلیا، شادی ہوئی، لاولد رہے، لہٰذا اولاد کی حسرت اور ناز نخرے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ قسمت کا شکوہ واویلا نہیں کیا، صبر و شکر سے زندگی گذار دی، دین سے لگاؤ تھا، مسجد حسینیاں شہداد پور کے ذاکر تھے، ان کی وفات کے بعد اس فریضہ کو ان کی بیوہ نے بڑے احسن طریقے سے نبھایا۔

الغرض اختر کا شمار شہداد پور کے پختہ کار اور استاد شعراء میں ہوتا تھا، لیکن بدقسمتی سے مرحوم کا بیشتر کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔

نمونہ کلام

نعت:

مظہر ذاتِ کبریا صلو علیہ وآلہٖ — باعثِ خلعتِ خدا صلو علیہ وآلہٖ
فرش اور عرش کا کوئی نشاں ہی نہ تھا — پہلے تھا نورِ مصطفےٰ صلو علیہ وآلہٖ
علم کا شہر ہیں نبیؐ قولِ رسولؐ دیکھ لو — در ہیں علی مرتضیٰؑ صلو علیہ وآلہٖ
جانِ نبیؐ حسنؑ حسینؑ، فاطمہ زہراؑ دل کا چین — قوتِ بازو لافتیٰ صلو علیہ وآلہٖ

جو ہے اطاعتِ نبیؐ وہ ہے اطاعتِ خدا
بندوں کو حکم ہے صدا صلو علیہ وآلہٖ

غزل:

نہ ہو جس دل میں دردِ قوم انساں ہو نہیں سکتا — جو ہو ملت کا باغی، وہ مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ دل کو چین ملتا ہے نہ شب کو نیند آتی ہے — سراپا درد جو ہو، اس کا درماں ہو نہیں سکتا
دیا ہے درد جس نے بس وہی میرا مسیحا ہے — گوارا میں کروں غیروں کا احساں ہو نہیں سکتا
علی شیرِ خدا نفسِ نبیؐ ہیں فاتحِ خیبر — شجاعت میں کوئی بھی شاہِ مرداں ہو نہیں سکتا

ادب فطرت میں داخل ہے مسلمانوں کی اے اختر
نہ ہو عشقِ سخن جب تک سخن داں ہو نہیں سکتا

☆☆☆

اختر ماہری

اصل نام محمد عبدالمجید خان، اختر تخلص اور اپنے اُستاد ماہر القادری کی نسبت سے ماہری لکھتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں بھارت کی ریاست جاورہ (گلشن آباد) میں پیدا ہوئے، کچھ عرصہ کھنڈوہ، اندور اور جبل پور بھی رہے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد ٹنڈو آدم آئے اور ۱۹۸۳ء تک یہاں رہے بعد ازاں کراچی منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۹۵ء میں انتقال ہوا۔ مرحوم کی دو بیویاں تھیں، پہلی بیوی سے ۳ بیٹے اور ۳ بیٹیاں جب کہ دوسری سے ۳ بیٹے اور آٹھ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان کی زندگی جہاں عیش و عشرت سے ہم کنار رہی وہاں آلام و مصائب سے بھی سابقہ پڑا، قناعت پسندی اُن کا خاصا تھی۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے بمبئی بازار ٹنڈو آدم میں ذاتی مطب تھا۔

مرحوم کا شمار ٹنڈو آدم کے بزرگ ترین اور کہنہ مشق غزل گو شعراء میں ہوتا تھا، وہ مولانا ماہر القادری مرحوم کے تلامذہ اور ادیب سہارن پوری کے دوستوں میں سے تھے، علاوہ ازیں بھارت کے شعراء بھوپالی، شوق ماہری، شاداں اندوری اور پاکستان کے متین اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر صفدر حسین، عبدالحمید عدم، پروفیسر تہر اور حافظ مظہر الدین مظہر سے بھی گہرا قرب و ربط رہا۔ ناصر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی اور علامہ اقبال کو بے حد پسند فرماتے تھے، طبعاً منس مکھ، ملن سار اور خوش دل آدمی تھے۔ غزل اُن کی محبوب صنف تھی تاہم اُن کے کلام میں غمِ جاناں کی نسبت غمِ دوراں کا ذکر زیادہ ملتا ہے، حسن و کیف اور تغزل و تصوف کی چاشنی نے کلام کو رنگین بنا دیا ہے، زبان صاف، لطیف اور سادہ ہے۔ حقیقی جذبات و تاثرات اور ذاتی تجربات کو بڑے ہی لطیف انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھالنے کے فن سے خوب واقف تھے۔

اُن کا کلام اُن کی ذاتی زندگی کا ترجمان ہے انھوں نے جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا یا پھر جو کچھ اُن کے ساتھ پیش آیا اُسے من و عن اشعار کی زبان میں کہہ ڈالا۔ وہ فن کی نزاکتوں اور بیان کی لطافتوں کو خوب سمجھتے اور جانتے تھے۔

نمونۂ کلام:

غزل نمبر۱:

رنج و غم میں جو مسکراتے ہیں حوصلے زندگی بڑھاتے ہیں
لوگ مر مر کے آپ کے غم میں از سرِ نو حیات پاتے ہیں
وقت یکساں کبھی نہیں رہتا دن مصیبت کے بیت جاتے ہیں
بزمِ عشرت میں بیٹھنے والے ہم کو آدابِ غم سکھاتے ہیں

لوگ سمجھے نہیں ابھی اختر
ہم سمجھ کر فریب کھاتے ہیں

غزل نمبر۲:

وہ تری یاد کا عالم جو کبھی کم نہ ہوا
تو نے نظروں سے گرایا بھی تو کچھ غم نہ ہوا
میرے ہونٹوں سے تبسم تو کبھی رم نہ ہوا
مجھے دنیا نے مٹایا بھی تو کچھ غم نہ ہوا
میری آنکھوں نے بہائے ہیں سمندر کتنے
دامنِ شوقِ محبت تو ذرا نم نہ ہوا
آج انجام کے ماتم کو لیے بیٹھے ہیں
ہم سے آغاز میں انجام کا ماتم نہ ہوا
فیصلہ ہے یہی اربابِ جنوں کا اختر
رابطہ جہل و خرد میں کبھی باہم نہ ہوا

☆☆☆

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر عزیز انصاری کے مضمون "وادیٔ مہران ۲" ایک غزل گو شاعر" اور مرحوم اختر ماہری کے بھتیجے جناب ظفر اللہ خان کی فراہم کردہ معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اسرار احمد اسرارؔ

پروفیسر اسرار احمد اسرارؔ ۱۹۶۵ء میں لاڑکانہ کالج میں کامرس پڑھاتے تھے، اُن ہی دنوں پروفیسر احتشام صاحب نیا علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم میں بحیثیت پرنسپل کام کر رہے تھے جو اسرارؔ صاحب کی قابلیت اور ذہانت سے خوب واقف تھے۔ اُنھوں نے اپنی خصوصی درخواست پر انھیں یہاں بلایا اور کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر تعینات کر دیا۔ پروفیسر احتشام کے بعد ۵ راپریل ۱۹۶۵ء سے ۳۱ رجولائی ۱۹۶۶ء تک وہ کالج کے ایکٹنگ پرنسپل بھی رہے۔ اس کے بعد جب پروفیسر سید محمد نصیر صاحب سٹی کالج حیدرآباد سے تبادلہ ہو کر مذکورہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو اسرارؔ صاحب کو وائس پرنسپل کی ذمہ داریاں دے دی گئیں۔ وہ اُن دنوں نوجوان تھے، نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ انھوں نے کالج کے طلبہ وطالبات کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے کالج کی ادبی تنظیموں "بزمِ ادب" اور "بزمِ لطیف" کو نئے خطوط پر استوار کیا اور انھیں فعال بنانے کے لیے اپنی تمام تر توانائی صرف کر دی۔ محفلِ مشاعرہ، مذاکرہ، شامِ افسانہ، ماہانہ ادبی کچہری سمیت مختلف مقابلے منعقد کرائے جن سے طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئیں۔ وہ طلبہ وطالبات کے محبوب اُستاد تھے جو طبعاً اور مزاجاً شفیق، ملنسار اور ہمدرد تھے۔ کالج کی ان ادبی سرگرمیوں سے اُن کی زندگی کا ایک حسین واقعہ بھی مربوط ہے۔ ماہانہ "ادبی کچہری" میں انٹر کی ایک طالبہ آنسہ نور جہاں کے ایک افسانے سے متاثر ہو کر انھوں نے زندگی کا ایک اہم فیصلہ کیا اور چند روز بعد نور جہاں کے والدین کی رضامندی سے اُسے اپنی شریکِ حیات بنا لیا۔

۱۹۷۳ء میں ان کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا، لیکن کچھ ہی عرصے بعد بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی پیش کش پر وہاں چلے گئے اور یونیورسٹی میں کامرس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد میں انھیں شعبۂ کامرس کے صدر کے طور پر ترقی دے دی گئی۔ زندگی کے باقی دن وہیں گذارے۔ دل کے مریض تھے، موت سے کوئی پانچ برس پہلے بھی ایک شدید حملے کی زد میں آ چکے تھے لیکن زندگی تھی اس لیے علاج معالجے کے بعد تندرست ہو گئے۔ پانچ برس بعد دوبارہ حملہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انھیں کوئٹہ سے کراچی لایا گیا تا کہ کسی اچھے اسپتال میں علاج ہو سکے لیکن زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وفات کے بعد ان کی اہلیہ نے بھی یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ملازمت کر لی۔

طبیعت میں شوخی اور مزاح کا عنصر موجود تھا، دل کے صاف تھے، دوست احباب اور شاگردوں میں گھل مل جاتے تھے، کالج میں پروفیسر شاہد کاظمی اور پروفیسر محسن شاہ بخاری سے خاص یارانہ تھا۔

شاعری کا شغف لڑکپن سے تھا تاہم نثر سے زیادہ لگاؤ تھا، پسندیدہ صنف افسانہ تھی۔ ''نئی قدریں'' حیدرآباد میں ان کی تخلیقات باقاعدگی سے شایع ہوتی تھیں، وہ نئی نسل کے نمائندہ شاعر تھے، ان کی ایک غزل جو بہ مشکل ہاتھ آئی ہے، سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے تجربات سے فائدہ اُٹھانا خوب جانتے تھے، روایت پسندی اور اندھی تقلید کے قائل نہ تھے، وہ اپنے اشعار کے ذریعے سماج کے علم برداروں پر تنقید کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور نئی نسل کو ان کا اصل مقام بھی دکھاتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل:

ہم تو قتیلِ رسم وفا ہیں، ہم کو کیا سمجھاتے ہو
وہ جو خوں میں ہاتھ رنگے ہیں کچھ ان کو سمجھاؤ گے

تم تاریخ کے دھارے موڑو یا یوں ہی گمنام مرو
یوں بھی تم کو پچھتانا ہے، یوں بھی تم پچھتاؤ گے

اے منھ موڑ کے جانے والو، کن راہوں پر چھوڑ چلے
نسلیں تم سے پوچھ رہی ہیں، ان کو کیا بتلاؤ گے

شہرِ طرب سے منزلِ غم تک ہر سو اک سناٹا ہے
گھر سے باہر نکلو گے تو راہوں میں کھو جاؤ گے

☆☆☆

افسرؔ گلشن آبادی

واحد نور نام، افسرؔ تخلص، ۱۹۱۸ء میں جاورہ (گلشن آباد، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں مع اہل و عیال پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۷۰ء تک ٹنڈو آدم میں مقیم رہے، بعد ازاں شہداد پور منتقل ہو گئے، انٹر پاس تھے تاہم بمبئی سے انجینئرنگ کا ڈپلومہ (ہیلر پاس) بھی حاصل کیا ہوا تھا۔ اسی ڈپلومہ کی بنیاد پر ٹنڈو آدم اور شہداد پور کی مختلف کاٹن فیکٹریوں میں بطور انجینئر کام کیا کچھ عرصہ ٹنڈو آدم کے جامعہ ملیہ ہائی اسکول میں معلم کے فرائض بھی انجام دیے۔ دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی بھارت ہی میں انتقال کر گئی تھیں، دوسری بیوی سے اولاد ہے جو شہداد پور میں قیام پذیر ہے۔ ۱۹۹۲ء میں انتقال ہوا۔ غزل اور نظم کے شاعر تھے لیکن بہت کم کہتے تھے۔ مشاعروں میں بھی کم ہی شریک ہوتے تھے البتہ مقامی سطح پر شایع ہونے والے اخبارات اور ادبی رسائل میں اِن کا کلام شایع ہوا کرتا تھا۔

نمونۂ کلام

تیری فطرت مردِ مومن کس قدر بے باک تھی
جھوٹ سے مکر و ریا سے تیری فطرت پاک تھی
سرنگوں قدموں میں تیرے گردشِ افلاک تھی
تیری نسبت، نسبتِ شاہِ شہِ لولاک تھی
ہو کے مومن غیر کے ٹکڑوں پہ تو پلتا رہا
قافلہ منزل پہ پہنچا اور تو سوتا رہا
تجھ کو فرمانِ رسولؐ پاک کا کچھ پاس ہو
تو مسلماں ہے تو اتنا دل تیرا حساس ہو
یاد آئیں گی تمہیں افسرؔ کی باتیں ایک دن
نور سے بھر جائیں گی تاریک راتیں ایک دن

☆☆☆

بصیر احمد بصیرؔ

۱۹۵۰ء کے لگ بھگ شہداد پور میں آئے۔ قیامِ پاکستان سے قبل مدراس میں رہتے تھے، یہی ان کا آبائی وطن بھی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے میاں بیوی دونوں ڈاکٹر تھے۔ شہداد پور میں اُن کا اپنا کلینک بھی تھا، بیوی سرکاری ملازم تھیں۔ ۱۹۶۰ء میں بیوی کا تبادلہ ٹنڈو آدم ہو گیا لہٰذا مستقل رہائش ٹنڈو آدم میں اختیار کر لی۔ تاہم خود روزانہ شہداد پور آؤٹ بیک کیا کرتے تھے۔

شعر و سخن سے لگاؤ لڑکپن سے تھا، لیکن دوست احباب کے بقول شعر گوئی کا آغاز شہداد پور قیام کے دنوں میں کیا، بشیر درانی سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل کے شاعر تھے، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور کلام مختلف جرائد و رسائل میں بھی شائع ہوتا تھا۔ یار باش شخص تھے، حلقۂ احباب وسیع تھا، ان کی رہائش پر ہر شام غفوری طرح نشستیں ہوا کرتی تھیں جس میں ان کے حلقے کے پانچ چھ شعراء حضرات باقاعدہ حصہ لیتے اور مشقِ سخن فرماتے تھے۔

۱۹۸۰ء کے لگ بھگ بیوی کا انتقال ہوا، چند سال بعد خود بھی رحلت فرما گئے۔ نرینہ اولاد نہیں تھی، ف بیٹیاں تھیں جو ان کی وفات کے بعد کراچی منتقل ہو گئیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

چمن میں دیکھ رہا ہوں میں رنگ رنگ کے پھول
کھلا رہے ہیں کبھی اپنے اپنے ڈھنگ کے پھول
دماغ و دل کو بھی صحرا کی وسعتیں دے دو
کھلائے جاؤ گے کب تک خیال تنگ کے پھول
فروغ اہلِ جنوں اور ان بہاروں میں
نہ ایسے ڈھنگ کا گلشن نہ ایسے رنگ کے پھول
ابھی سے آؤ نئی پود کا خیال کریں
کہ جیسے رنگ کی کلیاں ہوں ویسے رنگ کے پھول
چمن بصیر ہے اپنا نہ شاخ گل اپنی
میں نذر حسن کروں گا، بری اُمنگ کے پھول

غزل نمبر ۲:

وہ اور اُن کا وقتِ سفر کچھ نہ پوچھیے
افسردگی شام و سحر کچھ نہ پوچھیے
تاثیر ہائے زخمِ جگر کچھ نہ پوچھیے
خونبارگی دیدۂ تر کچھ نہ پوچھیے
رُخ اور گیسوؤں کے تصور سے ہر گھڑی
گزرے ہیں کتنے شام و سحر کچھ نہ پوچھیے
شبنم کی طرح اشک فشانی جو ہوسکے
دامن دریدہ گل سے مگر کچھ نہ پوچھیے
دار و رسن کی راہیں نہ کھل جائیں پھر بصیر
دیوانگی دل کی خبر کچھ نہ پوچھیے

☆☆☆

بھوت شاہ جہاں پوری

اصل نام تو معلوم نہیں کیا تھا، بھوت شاہ جہاں پوری کے نام سے مشہور تھے۔ بھوت تخلص فرماتے تھے جو اُن کے استاد اور دوست ڈاکٹر قیصر افغانی نے تجویز فرمایا تھا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہجرت کرکے سانگھڑ میں آباد ہوئے۔ شاہ جہاں پور آبائی شہر تھا، چناں چہ نام کے ساتھ "شاہ جہاں پوری" ضرور لکھتے تھے۔ سانگھڑ شہر میں ایک ہوٹل اور ایک کینٹین چلایا کرتے تھے۔ شعر وسخن سے خاصا شغف تھا۔ عمر میں ڈاکٹر قیصر افغانی مرحوم سے کافی بڑے تھے مگر اس کے باوجود ان سے یارانہ تھا۔ نہایت زعفران زار طبیعت کے مالک تھے۔ شاعری میں بھی طنز ومزاح ہی کو ذریعۂ اظہار بنایا، مشاعروں میں خوب داد وصول کرتے تھے۔ ان کا کلام مقامی جرائد ورسائل کی زینت بھی بنتا رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر قیصر افغانی مرحوم سے اصلاح لیتے ہوں گے، اُن ہی کی تحریک پر مشاعرے پڑھنا شروع کیے۔ زندگی کے آخری دس بارہ برس شعر کہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء سے کچھ پہلے ڈاکٹر قیصر افغانی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کی غرض سے کراچی گئے تھے، جہاں ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوئے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

لگا کے سُرخی و پوڈر بڑا سنگھار کیا
پھر اُس کے بعد مجھے اُس نے ہم کنار کیا

کیا تھا وعدہ مگر وہ نہ آئی وائے نصیب
تمام رات حسین کا انتظار کیا

کروں گا روز میں چالان پھر حسینوں کا
کبھی خدا نے جو بھوتؔ تھانے دار کیا

غزل نمبر۲:

یہ ہرگز میری گھر والی نہیں ہے
بہت گوری ہے وہ کالی نہیں ہے

مہم جاری ہے مچھر مار لوگو
ہمارے گھر میں قوالی نہیں ہے

بڑھا رکھے ہیں جس نے بال لمبے
وہ سالہ ہے مرا سالی نہیں ہے

غزل نمبر۳:

پیڑ پر پہلے تھا میں لٹکا ہوا
اور اب ہوں جہاز میں اٹکا ہوا

پانی پی پی کر گھڑا خالی کیا
پیٹ تب جا کر مرا مٹکا ہوا

آپ مجھ سے جب نہیں ناراض تو
کس لیے پھر منہ ہے یہ لٹکا ہوا

آپ ہی رستہ مجھے بتلایئے
پھر رہا ہوں کب سے میں بھٹکا ہوا

آپ کی صورت بھی کیا بھوتؔ ہے
جس طرح غنچہ کوئی چٹکا ہوا

☆☆☆

بیدار رام پوری

نام محمود علی خان، تخلص بیدار، جب کہ آبائی وطن رام پور کی مناسبت سے رام پوری لکھتے تھے۔ ایک دین دار اور تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ساتھ علم طب، علم نجوم اور علم الاعداد پر بھی خاص دسترس حاصل کی۔ علم و ادب کے دلدادہ تھے چناں چہ کچھ عرصہ معلمی کے فرائض بھی انجام دیے اور صحافت بھی کی۔ آگرہ سے "عزرائیل" اور لاہور سے "زمیندار" کے نام سے اخبار جاری کیے۔ ۱۹۳۹ء میں طب کا امتحان پاس کرنے کے بعد تا حیات اسی پیشے سے وابستہ رہے۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور شہداد پور میں مکمل سکونت اختیار کرلی، جہاں " لیبارٹریز کے نام سے ایک تجربہ گاہ قائم کی، جس کی مصنوعات کی ترسیل پورے سندھ میں ہوا کرتی تھی۔

شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا، طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ حضرت سخاوت حسین شوخ اکبر آبادی اور مولوی عبدالحق میرٹھی سے اصلاحِ سخن لی، شوخ سے بے حد متاثر تھے، چناں چہ ان ہی کے رنگ میں شعر کہنا شروع ہوئے۔ شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ غزل، منقبت، قصیدہ، نعت، سلام اور نظم پر مکمل دسترس تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر کے مظالم کے خلاف قلمی جہاد میں بھرپور حصہ لیا۔ "ہٹلر"، "خونی باب" اور "باغی" جیسی طویل نظموں کے ذریعے نہ صرف ہٹلر سے شدید نفرت کا اظہار کیا بلکہ اُس کے انسانیت سوز مظالم کی کھلی اور بھرپور مذمت بھی کی۔

تمام عمر جہدِ مسلسل میں گذری، بارہا نشیب و فراز بھی آئے، زمانے کی بے راہ روی اور بے التفاتی نے ارمانوں کا خون بھی کیا لیکن انھوں نے ان تمام آلام و مصائب کا ہنس کر سامنا کیا۔ ان نشیب و فراز کا اثر ان کی شاعری پر پڑا۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے اپنے تمام درد اپنی شاعری میں سمو دیے اور ان کی شاعری ایک حساس دل کی ترجمان بن کر سامنے آئی۔

زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے اپنی تمام تر تخلیقات کو اشاعت کی غرض سے جمع کیا جنھیں

بد قسمتی سے کوئی عاقبت نا اندیش شخص ان کے مطلب سے نجرا کر لے گیا، جس کا انھیں بے حد دکھ ہوا اور شاید یہی صدمہ ان کی زندگی پر ضرب کاری ثابت ہوا، وہ سرطان کے جان لیوا مرض میں تو پہلے ہی مبتلا تھے، اوپر سے اس ناقابل برداشت صدمے نے ان کی جان لے لی۔ ۳ رجون ۱۹۸۲ء کو ان کا انتقال ہوا اور شہداد پور ہی میں تدفین عمل میں آئی۔ اولاد میں تمام بیٹے، بیٹیاں نہ صرف تعلیم یافتہ ہیں بلکہ شعر و سخن سے خاصا شغف بھی رکھتے ہیں اسی طرح ان کے دیگر شاگردوں میں سے چند ایک اس وقت صاحب دیوان شاعر ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

گلشن دہر میں پھر تازہ بہار آئی ہے — دل کے زخموں کے لیے تازگی بر آئی ہے

ہم تو راز محبت کا کوئی غیر نہیں — درد ہے، یاس ہے، سوز شب تنہائی ہے

فلسفہ عشق و محبت کا نہیں اس کے سوا — داستاں غم کی ہے اور رات کی تنہائی ہے

اس سے پوچھے کوئی انجام جوانی و شباب — صحن گلشن میں کلی کھل کے جو مرجھائی ہے

دل کے غم خانے سے بیدارؔ یہ اٹھتی ہے صدا
ماحصل زیست کا اک حسن کی انگڑائی ہے

غزل نمبر ۲:

تجلی گناہ جو میرے قلب و جگر میں تھا — وہ نامۂ سیاہ کی پہلی سطر میں تھا

تھا وقت شام اور وہ طوفان موجزن — ساحل سے دور ایک سفینہ بھنور میں تھا

عظمت کا جس کی طور بھی حامل نہ ہو سکا — وہ حسن لازوال مری چشم تر میں تھا

انساں کو سرفراز کیا اس کے فیض نے — وہ جوہر نیاز جو ابوالبشر میں تھا

بیدارؔ اس کی عظمت و شان کا ہو کیا بیان
وہ سجدۂ نیاز جو کرب و سفر میں تھا

☆☆☆

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں پروفیسر قمر الحق صدیقی کے مضمون "حکیم محمود علی خان بیدارؔ مرحوم" سلیمہ شبیر صدیقی، مرتبہ فاضل ایس ڈی، ۱۹۹۱ء، (شہداد پور) سے مدد لی گئی۔

حبیب الحسن بدایونی

بدایوں کے رہنے والے تھے، تقسیم ہند کے بعد شہداد پور آ گئے، جہاں دارالتجربات کے نام سے مطب قائم کیا، اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے، صحافت سے بھی تھوڑا بہت شغف تھا۔ شہداد پور سے "ترکش" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کی کتابت و طباعت خود ہی کرتے تھے، یہ پرچہ لیتھو پریس پر چھپتا تھا، خالصتاً ادبی تو نہ تھا مگر زیادہ تر صفحات شعر و ادب ہی کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ موصوف کی اپنی شاعری اسی پرچے میں شائع ہوتی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت "ترکش" کی کوئی کاپی مجھے باوجود کوشش کے نہیں مل سکی اور نہ ہی ان کا کلام دست یاب ہو سکا۔ صرف ایک شعر مل سکا ہے۔

موصوف ۱۹۶۳ء میں کراچی منتقل ہو گئے تھے جہاں کچھ عرصہ قرآن مجید کی کتابت بھی کرتے رہے تھے۔

نمونۂ کلام

سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر

☆☆☆

حسن بخش شاہ جیلانی ڈھڑائی

پیر حسن بخش شاہ جیلانی جنھیں "ہادی سائیں" بھی کہا جاتا ہے، اندازاً ۱۲۶۲ھ/۱۸۳۶ء میں ڈھڑو شریف تعلقہ ٹنڈو آدم میں اپنے نانا پیر سید سبحان علی شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیر سید گلزار علی شاہ حیدرآباد کے نزدیک پیر بھاون شاہ کے گاؤں میں رہتے تھے۔ اُن کی آخری آرام گاہ بھی وہیں ہے۔ آپ صاحبِ طریقت بزرگ تھے، سلسلۂ نسب پیرانِ پیر حضرت سید عبدالقادر شاہ جیلانیؒ سے ملتا ہے اسی لیے جیلانی کہلائے۔ ان کا اصل وطن "برہان پور" تھا، لیکن ان کی پیدائش سے بہت پہلے ان کے بڑے ہجرت کر کے سندھ کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے۔

انھوں نے سندھی، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا کی زیرِ سرپرستی حاصل کی۔ مطالعے کے بے حد شوقین تھے، ذاتی کتب خانہ تھا جس میں سیکڑوں کتب موجود تھیں۔ علاوہ ازیں ملاکھڑے، شکار اور راگ رنگ سے بھی لگاؤ تھا۔ وقت کے کئی مشہور گلوکار ان کی محفل میں موجود رہتے تھے، تقریباً ہر روز ہی موسیقی کی محفل ہوا کرتی تھی جس میں آپ کی کافیوں کے ساتھ ساتھ سندھ کے دیگر صوفی شعرا کی کافیوں پر نغمہ سرائی ہوتی تھی۔

حسن بخش نے عربی، فارسی، سندھی، ہندی، اُردو اور سرائیکی زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اپنی درویشانہ طبیعت کے سبب کلام جمع نہیں کر سکے۔ ۱۹۵۵ء میں جب سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے ان کے کلام کی طباعت اور اشاعت کا ارادہ کیا تو پیر شاہ نواز شاہ عارف المولا نے جدوجہد کر کے بہ مشکل چالیس پچاس

کافیاں اور تقریباً اتنے ہی اشعار جمع کیے، جسے بعد میں سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے پہلی بار ۱۹۵۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۷۱ء میں شایع کیا، اس دیوان میں زیادہ تر سندھی کلام ہے، چند ایک سرائیکی کافیاں اور دوہے، ایک ہندی اور چند اشعار اُردو کے ہیں، جس میں سے ایک نعت ہے، جیسا کہ مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ موصوف کا زیادہ تر کلام محفوظ نہ ہونے کی صورت میں ضائع ہو چکا ہے ممکن ہے کہ اُردو کی مزید غزلیات یا نعتیں بھی اسی عدم تحفظ کا شکار ہو گئیں ہوں۔ راقم نے موصوف کا سندھی، اُردو اور سرائیکی کلام بغور پڑھا ہے، ان کے کلام میں جہاں حسن و عشق، ہجر و فراق اور عاشقانہ خیالات پائے جاتے ہیں وہاں انسانیت سے محبت اور پیار کا درس بھی ملتا ہے۔ کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے، بعض جگہ ایک ہی کلام میں کئی زبانیں بیک وقت استعمال کی ہیں۔

نمونۂ کلام

نعت:

محبت جام مُے مجھ کو پلادے یا رسول اللہ ﷺ
شراب مست مدھوشی ملادے یا رسول اللہ ﷺ
پیالوں سے شوق نت شافی، تمھیں ہر روز ہر شب کو
نبی ہے نور تجھ نیارا، ولا دے یا رسول اللہ ﷺ
طمع دنیا ترک کر کے چھڑا دے شرک شیطانی
نہ وتے نفس کا رایا جلا دے یا رسول اللہ

ذاکرا! مُے جام زم زم ذوقِ ذاتی کوثری
مُے پیالوں سے آبِ احمدؐ ہے حیاتی ہمسری
صوفی صورت صاف کر دے، یہ صفاتی عنصری
ہفت اقلیمی مرا ہے، بھید راہِ رہبری

☆☆☆

خاکؔ کلیمی اجمیری

نام محمد حسین، تخلص خاکؔ، آبائی وطن اجمیر شریف کی نسبت سے اجمیری۔ جب کہ اپنے اُستاد عبدالصمد کلیم کی نسبت سے کلیمی لکھتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں اجمیر شریف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی، کچھ عرصہ حافظ محمد یوسف سے اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۰ء میں حضرت میاں رحمت اللہ علی گڑھی کے ہاتھوں بیعت ہوئے اور نعت کہنے لگے، بعد ازاں شاعری شناخت بن گئی۔

مرحوم زود گو شاعر تھے، شاگردوں کی فہرست بھی طویل ہے، جناب سرور احمد نے اپنے ایم اے کے مقالے میں مرحوم کے شاگردوں میں حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی، حضرت عرشیؔ اجمیری، اخترؔ مودودی، عبدالعزیز خان عزیزؔ، یوسفؔ اجمیری اور حضرت کیفؔ عرفانی کے اسمائے گرامی کو قابلِ ذکر جانتے ہوئے لکھا ہے کہ مرحوم کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

مرحوم قیامِ پاکستان کے فوراً بعد، ہجرت کر کے ٹنڈو آدم میں آئے، کچھ عرصہ یہاں مقیم رہنے کے بعد حیدر آباد منتقل ہو گئے، جہاں ۲۳ ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

نمونۂ کلام

کوئی مشکل نہیں اے خاک حمدِ خالقِ باری
مگر لکھنا بہت دشوار ہے نعتِ پیمبرؐ کا

تجھ کو اے ماہِ عربؐ حُسن میں یکتا دیکھا
رُخ ترا صاف ہے اور چاند میں دھبہ دیکھا
ہم گنہ گار نہ ہوتے تو نہ ہوتی بخشش
صدقۂ جرم میں دیدار خدا کا دیکھا

مجھ سے کیا پوچھتے ہو حُسنِ دل افروز کا حال
آئینہ دے گا جواب آپ کی یکتائی کا

کچھ دل کے سکوں کا ساماں کر، تو دل کے تجلی خانے میں
تسکینِ نظر کچھ بات نہیں، تسکینِ نظر ہو جاتی ہے

لوٹا کیے ہوں حسنِ شب افروز کے مزے
اک شمع زو کو شمعِ شبستاں کیے ہوئے
حیراں کیے ہوئے ہے انہیں عکسِ آئینہ
بیٹھے ہیں آئینے کو وہ حیراں کیے ہوئے

☆☆☆

دردؔ سعیدی

نام محمد صدیق تھا، دردؔ تخلص اور سعیدی نسبت تھی۔ ریاست ٹونک سے تعلق تھا۔ کم سنی میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے تھے، ماں نے گھر گھر ملازمت کر کے پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی چلے گئے جہاں ۱۹۴۹ء تک مقیم رہے اس کے بعد عازمِ پاکستان ہوئے اور ٹنڈو آدم کو مستقل جائے سکونت بنایا، ہجرت کے چند ہی سالوں بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا اس طرح دنیا میں اکیلے رہ گئے، شادی بچپن میں ہوئی تھی جو ناکام ثابت ہوئی، اس کے بعد آخر تک تجردانہ زندگی گزاری۔ ٹنڈو آدم میں پہلے جامعہ ملیہ پرائمری اسکول میں معلم ہوئے پھر میونسپلٹی میں ناکہ منشی ہو گئے، جہاں سے تبادلہ کروا کر میونسپل لائبریری میں انچارج مقرر ہو گئے اور تادمِ آخر اسی سے منسلک رہے۔

شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا، طبیعت کی موزونیت اور ٹونک کی علمی ادبی فضا نے ذوق کو پروان چڑھایا۔ حضرت بسملؔ سعیدی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیے، ہجرت سے پہلے ٹونک اور دہلی میں بطور شاعر اعتبار قائم کر چکے تھے۔ ٹنڈو آدم آنے کے بعد، یہاں کی بنجر زمین پر شعر و ادب کے پھول بوٹے اگائے، انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی، علمی و ادبی مجلسوں کا اہتمام کیا، ان ہی کی کوششوں سے ۱۹۵۱ء میں ٹنڈو آدم میں "پاک و ہند مشاعرہ" منعقد ہوا جس میں بھارت سے جگرؔ مرادآبادی، اسرارالحق مجازؔ اور جگن ناتھ آزادؔ جیسے نامور شعراء نے شرکت کی۔ مختصر یہ کہ دردؔ نے ہر قسم کی دشواریوں اور حالات کی ناسازگاریوں کے باوجود ٹنڈو آدم میں شعر و ادب کی شمع کو فروزاں رکھا، شروع شروع میں وہ یہاں سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "پرواز" میں "سنگ و خشت" کے عنوان سے فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔ بعد ازاں ۱۹۵۵ء کے قریب دو نصف

ماہی رسالے ''قائد'' اور ''شعور'' جاری کیے جو ایک مدت تک علمی، ادبی حلقوں کی ضرورت بنے رہے۔

دردؔ کا شمار ضلع سانگھڑ کے بزرگ اور استاد شعراء میں ہوتا تھا۔ وہ غزل میں مومنؔ، غالبؔ، میرؔ، فانیؔ، جگرؔ اور اقبالؔ جب کہ نظم میں نظیرؔ اکبر آبادی، اسماعیل میرٹھی، اقبالؔ اور حالیؔ سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ حلقۂ احباب میں حضرت نیاز فتح پوری، مولوی عبدالحق، مولانا ناصر جلالی، نصر اللہ خان عزیزؔ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، جوہر سعیدی اور مولانا ماہر القادری کے نام ملتے ہیں۔

دردؔ کا شعری مجموعہ ''شعلۂ جاں'' اور دو کتابچے ''اُردو کی فریاد'' اور ''دردؔ سعیدی کے سو اشعار'' ان کی زندگی ہی میں شایع ہو گئے تھے۔ ''اُردو کی فریاد'' ایک طویل نظم ہے جو مولوی عبدالحق کی تقریظ کے ساتھ شایع ہوئی جب کہ ''درد سعیدی کے سو اشعار'' کا پیش لفظ نیاز فتح پوری نے تحریر کیا۔

یہ قادر الکلام اور استاد شاعر، سرطان کے جان لیوا مرض میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر ۳؍ اگست ۱۹۶۶ء کو اس دارِفانی سے رحلت فرما گئے، رفقا نے انھیں ''بابا اسماعیل شاہ قبرستان'' میں سپردِ خاک کیا۔ ان کی وفات کے بعد ضیاء عزیزی اور پروفیسر قدا انصاری نے سانگھڑ کے شعراء کا منتخب کلام کتابی صورت میں شایع کیا جس کا نام ''دیارِ سخن'' ہے، مرتبین نے اس مجموعے کو مرحوم دردؔ سعیدی کے نامِ نامی سے معنون کیا، علاوہ ازیں تمر ہاشمی نے مرثیہ جب کہ مولانا ماہر القادری، پروفیسر مشتاق جعفری اور ڈاکٹر عزیز انصاری نے اپنے مضامین میں دردؔ کی شخصیت، فن اور علمی ادبی کاوشوں پر روشنی ڈالی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱

کیا کہوں اے ہم نفس، دنیا کی حالت کیا کہوں
دوستوں کی دشمنی، اپنی محبت کیا کہوں

چند آہیں، چند آنسو، ذلت و افلاس کے
جذبۂ انسانیت کی قدر و قیمت کیا کہوں

جیسے میں مجرم ہوں، میں نے ہی کیا ہے جرم یہ
دوسرے کے جرم پہ اپنی ندامت کیا کہوں

اہلِ عالم کا ''جنونِ سنگ باری'' کچھ نہ پوچھ
اور اپنے شیشۂ دل کی نزاکت کیا کہوں

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر عزیز انصاری صاحب کے مضمون ''اک دردؔ سعیدی تھا لوگو'' مطبوعہ ''نئی قدریں''، حیدرآباد، ۱۹۷۱ء اور مشتاق علی جعفری کے مقالہ ''سندھ کے جدید اُردو شعراء'' مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۰ء سے مدد لی گئی ہے۔

غزل نمبر۲:

خود نہیں معلوم اپنے دل میں کیا رکھتا ہوں میں
یعنی دور از عقل و فہم، اِک مدّعا رکھتا ہوں میں

مسکرا دیتے ہیں گاہے دیکھ کر میری طرف
اس قدر تو اب بھی اُن سے واسطہ رکھتا ہوں میں

اُٹھ کر آ جاتا ہوں، اُن کی بزم سے روز اس طرح
آج کی اُمید پھر کل پر اُٹھا رکھتا ہوں میں

جب کسی منزل پہ بھی ملتا نہیں دل کو سکوں
سوچتا رہتا ہوں آخر عزم کیا رکھتا ہوں میں

بات کرنی بھی ہے مشکل، دردؔ شاعر کے لیے
شعر کہنا جیسی حالت میں روا رکھتا ہوں میں

☆☆☆

رونق علی رونق

۱۹۳۵ء میں محلہ بالاکوٹ، بلند شہر یو۔پی (بھارت) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی، ۱۹۵۲ء میں شہداد پور آئے اور اپنے برادر نسبتی بیدار رام پوری کے ساتھ رہنے لگے، محمود لیبارٹریز میں کام کرتے تھے، ادویات کی سندھ بھر میں ترسیل کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ زندگی کی مصروفیات اور بیماری نے شادی کی مہلت نہیں دی، ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھے، ۱۹۷۰ء میں عباسی شہید اسپتال کراچی میں انتقال ہوا، شہداد پور میں مدفون ہیں۔

بیدار رام پوری کی صحبت کا اثر تھا کہ شاعری کی طرف مائل ہو گئے، اُن دنوں بیدار رام پوری شہداد پور کے استاد شعرا میں نمایاں مقام رکھتے تھے چناں چہ ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے اور ان سے باقاعدہ اصلاح لینے لگے۔ مقامی مشاعرے شوق سے پڑھتے تھے۔ ترنم خوب تھا، سامعین محو ہو کر سنتے تھے، اگر چہ اندر سے کافی ٹوٹے ہوئے انسان تھے مگر طبیعت پر مزاح کا عنصر غالب تھا۔ لاابالی پن میں مختلف اوراق اور سگریٹ کے پیکٹوں پر اشعار لکھ کر اِدھر اُدھر پھینک دیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کلام محفوظ نہیں رہا۔ زیادہ تر غزل کہتے تھے، کلام میں احساسِ محرومی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

نمونہ کلام

غزل نمبرا:

ایفائے محبت کا تو امکاں نہیں دیکھا
پورا کبھی ہوتے ہوئے پیماں نہیں دیکھا
فریاد و فغاں، جور و جفا، نالہ و گریہ
اور بزمِ جہاں میں کوئی ساماں نہیں دیکھا
اپنے دلِ رفتہ کا پتہ ہے نہ نشاں ہے
تو نے تو کہیں عمرِ گریزاں نہیں دیکھا
گرداب سے وہ کس طرح نکلے گا سفینہ
ساحل کے سوا جس نے کہ طوفاں نہیں دیکھا
کیوں اتنے پریشاں ہو میرے حال پہ رونقؔ
کیا تم نے کبھی گردشِ دوراں نہیں دیکھا

غزل نمبر۲:

اور تو کون ہمارا ہے قریب آجاؤ
تم کو رہ رہ کے پکارا ہے قریب آجاؤ
قتل کرنے کی جو عادت ہے کوئی بات نہیں
مجھ کو مرنا ہی گوارا ہے قریب آجاؤ
روبرو آئینے کے اور رہو گے کب تک
زلفِ برہم کو سنوارا ہے قریب آجاؤ
ختم ہونے کو ہے اب رونقؔ ہستی دیکھو
آسرا صرف تمہارا ہے قریب آجاؤ

☆☆☆

سفیرؔ گلشن آبادی

نام عظمت اللہ خان، تخلص سفیرؔ، اپنے آبائی وطن گلشن آباد (جاورہ) کی نسبت سے گلشن آبادی لکھتے تھے۔ ۱۵/جنوری ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے، فارسی، اُردو اور عربی کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔ باقاعدہ کسی مدرسے یا اسکول میں داخل نہیں رہے، اسی لیے کسی تعلیمی سند وغیرہ کے حامل نہ تھے۔ ۱۹۳۹ء میں بیوی بچے ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آ گئے، خود بہ سبب ملازمت چند سال بھارت ہی میں ٹھہرے رہے، لیکن بیوی بچوں کی محبت ملازمت پر سبقت لے گئی۔ ۶/اگست ۱۹۵۱ء کو ٹنڈو آدم آ گئے اور جامعہ ملیہ ہائی اسکول میں منشی مقرر ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ فارسی کی کلاس بھی لیا کرتے تھے۔

ہوش سنبھالتے ہی شعر کہنے لگے، طبیعت موزوں پائی تھی، شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی، ان کے غیر مطبوعہ مجموعے میں غزل، نعت، حمد، منقبت، قصیدہ، قطعات، سلام، مناجات اور مسدس کے نمونے ملتے ہیں، ایمانِ مفصل سمیت قرآن پاک کی چند ایک مختصر سورتوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔ اُس وقت کے وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے ان کے کلام سے متاثر ہو کر "اکادمی ادبیات پاکستان" کو ماہانہ وظیفہ کی سفارش کی تھی جو پانچ سو روپے ماہانہ کی صورت میں تا وقتِ مرگ انھیں ملتا رہا۔

مختلف اصنافِ شاعری پر مشتمل کلام کی تعداد پانچ چھ سو کے لگ بھگ ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور ان کے صاحبزادوں کے پاس موجود ہے۔ اس میں اچھی خاصی تعداد غزلیات کی ہے۔

سفیرؔ کا انتقال ۳/جون ۱۹۸۳ء کو ہوا، ٹنڈو آدم میں مدفون ہیں۔

ٹ: چند برس قبل ٹنڈو آدم کے نوجوان غلام مصطفیٰ قادری نے موصوف کے فن اور شخصیت پر ایم اے اردو کے لیے مقالہ تحریر کیا۔

نمونۂ کلام

نعت:

ہو دل میں اگر منقبتِ سلطانِ مدینہؐ
کرتی ہے زباں مدحِ سلطانِ مدینہؐ

دل میں رہے سلطانِ مدینہ کا تصور
آنکھوں میں رہے حسرتِ سلطانِ مدینہؐ

مشکل ہے کہ سمجھے کوئی اللہ کی حکمت
دیکھے کوئی کیفیتِ سلطانِ مدینہؐ

محشر میں سقیرؔ اپنا عمل ہی نہیں سب کچھ
ہے شرط یہاں نسبتِ سلطانِ مدینہؐ

غزل:

زلف کے پیچ و خم بڑھ گئے
اب خوشی ہے کہ غم بڑھ گئے

منزلِ شوق تھی سامنے
خود ہی میرے قدم بڑھ گئے

جب مسرت کوئی بڑھ گئی
میں نے سمجھا کہ غم بڑھ گئے

بے کلی بڑھ گئی اور بھی
جب تمہارے کرم بڑھ گئے

وائے غفلت سقیرؔ حزیں
کارواں صبح دم بڑھ گئے

☆☆☆

سلیم احسن سلیم

نام سلیم احسن، تخلص سلیم، مراد آباد میں پیدا ہوئے، تقسیم ہند کے بعد شہداد پور کو مسکن بنایا، مقامی پٹرول پمپ پر ملازمت کرتے تھے، مالی حالات زیادہ اچھے نہ تھے، گذر بسر مشکل ہی سے ہوتا تھا، تمام زندگی محرومیوں میں گزاری، ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہوئے، لیکن احباب کا کہنا ہے کہ اپنی معاشی پریشانیوں سے تنگ آکر خودکشی کی تھی (واللہ اعلم بالصواب)

غزل کے منجھے ہوئے شاعر تھے۔ شاعری پر ان کی معاشی زندگی کا اثر کافی پڑا اسی لیے غم جاناں کی نسبت غم دوراں کو زیادہ نظم کیا، انھوں نے شاعری میں غزل کے قدیم و جدید رنگ کا ایسا امتزاج پیدا کیا جو قوس وقزح سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ ان کے اشعار میں ایک حساس دل کی تڑپ پائی جاتی ہے جو فوراً سامع کے دل پر اثر کرتی ہے۔ احباب کے بقول، مرحوم کا لہجہ پاٹ دار آواز کے ساتھ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ محفل شعر و سخن میں شعر پڑھتے وقت خود سراپا شعر بن جاتے تھے، جھوم جھوم کر نہایت جوش و خروش کے ساتھ شعر پڑھتے اور محفل پر وجد طاری کردیتے تھے، مشاعروں میں اپنا اچھا تاثر چھوڑتے تھے۔

نمونۂ کلام

غزل:

یہ بھی کوشش تو نہیں ہے کسی دیوانے کی
قافلے راہ پہ آنکلے ہیں ویرانے کی

ان کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی پی لیتا ہوں
مجھ کو ساغر کی ضرورت ہے نہ پیمانے کی

دیکھی ہم نے بھی بہت کشمکشِ عقل و جنوں
بات ہر دور میں بالا رہی دیوانے کی

ہر کہانی میں ہے پر تو برے افسانے کا
ہر حقیقت کو ضرورت برے افسانے کی

اے سلیم عشق کے صدقے وہ مقام آ پہنچا
جب نہ اپنے کی ضرورت ہے نہ بیگانے کی

☆☆☆

سیفؔ شہداد پوری

اصل نام سید عبدالرحمان، شعر و سخن کی دنیا میں سیفؔ شہداد پوری اور عرفِ عام میں "شاہ جی" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں دائرہ کھنڈیلہ تحصیل توراوائی، ریاست جے پور (بھارت) میں پیدا ہوئے، فارسی اور اُردو کی تعلیم اپنے دادا سید جمال علی سے حاصل کی، جوان ہوئے تو ملٹری میں بھرتی ہو گئے، دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لیا پھر مڈل ایسٹ چلے گئے، تقسیم ہند کے بعد شہداد پور کو مسکن بنایا، یہاں بھی ملٹری ہی جوائن کی، جنگِ کشمیر ۱۹۴۸ء اور جنگ ۱۹۶۵ء میں بھی حصہ لیا، فوجی ملازمت کی مدت پوری ہونے کے بعد نیشنل موٹرز میں ملازم ہو گئے، جہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد باقی ماندہ زندگی شہداد پور میں ادبی اور ثقافتی فضا کو خوش گوار بنانے میں صرف کی۔ ۲ر جنوری ۱۹۹۶ء کو کراچی سے شہداد پور آتے وقت ٹنڈو آدم اور شہداد پور کے درمیان ڈاکوؤں کے ہاتھوں جاں بحق ہو گئے۔

مزاحیہ شاعری اُن کا خاصا تھی، فاضل حیدی سے اصلاح لیتے تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اسٹیج ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔ المشرق آرٹ اکیڈمی کے سرگرم کارکن اور عہدیدار بھی رہے۔ اسی' ذی نے انھیں بحیثیت شاعر اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے میں معاونت کی۔ طنز و مزاح کے اشعار میں دل کی بات بیان کرنے میں بھی انھیں مہارت تھی۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

آنکھیں لڑا رہے ہیں بڑی احتیاط سے　　دل میں سما رہے ہیں بڑی احتیاط سے
اب انگلیوں پہ اپنی مجھے صبح و شام وہ　　یار، نچا رہے ہیں بڑی احتیاط سے
دانے کے ساتھ دام بچھاتا ہے ایک فن　　ہم کو پھنسا رہے ہیں بڑی احتیاط سے
چوڑی نہ ٹوٹ جائے کہیں ان کے ہاتھ کی　　تالی بجا رہے ہیں بڑی احتیاط سے

ہم کو تو دال روٹی میں الجھا دیا ہے سیفؔ
خود مرغ کھا رہے ہیں بڑی احتیاط سے

غزل نمبر ۲:

ذہن میں گل بلا رہی ہے بھینس　　فکر کا منہ چڑا رہی ہے بھینس
اس حقیقت سے سب ہی واقف ہیں　　سیکڑوں گھر چلا رہی ہے بھینس
روڈ پر اس طرح سے چلتی ہے　　جیسے سرکار جا رہی ہے بھینس

سیفؔ صاحب کے شعر سن سن کر
زیرِ لب مسکرا رہی ہے بھینس

☆☆☆

شاہ نواز خادمؔ

نواب شاہ نواز خادمؔ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت ان کے ماموں حاجی نواب گل محمد خان لغاری ساکن تعلقہ جھڈو نے کی۔ اردو میں خوب مشق سخن کی اور خوب کہا لیکن ان کا کلام بھی محفوظ نہیں رہ سکا، صرف چند اشعار مل سکے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی وطن گاؤں تاج پور ہجرت کر گئے۔ ضلع سانگھڑ میں تقریباً دس سال کا عرصہ گذارا۔

نمونۂ کلام

نہیں بھاتی یہ گردش آسماں کی
بگڑ جاتی ہے رنگت داستاں کی

قدم گلشن میں یوں رکھتے نہ ہرگز
روش اچھی نہیں تھی باغباں کی

کرو آزاد میری جاں قفس سے
یہی فریاد ہے مجھ بے زباں کی

☆☆☆

شاہ نواز شاہ عارفؔ المولا

شاہ نواز شاہ المتخلص بہ عارفؔ المولا ۱۹۲۳ء میں شہداد پور کے قریب ڈھٹرو شریف (تعلقہ ٹنڈو آدم) میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور سندھی کی بنیادی تعلیم حاصل کی، اُردو بھی جانتے تھے۔ شاعری کا شغف فطری تھا جو بچپن ہی میں ظاہر ہوگیا تھا۔ موزوں طبیعت پائی تھی، غزل، نظم، گیت، ٹھمری اور وائی میں طبع آزمائی کی۔ مخدوم محمد زماں طالبؔ المولا سے خاص نسبت رہی ہے اُن کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں اپنے بزرگ پیر حسن بخش شاہ جیلانی ڈھٹرائی کا کلام مرتب کیا۔ ان کا دیوان (بر مشتمل بہ سندھی کلام) ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عاشق المولا اور اکبر علی لغاری بلوچ کی کوششوں سے مرتب ہوا جو ۱۹۹۲ء میں طالبؔ المولا کی ذاتی دلچسپی سے چھپ کر منصۂ شہود پر آیا۔

نمونہ کلام

یہ جو اِک ہوک اُٹھتی ہے مرے سینے میں رہ رہ کر
مجھے ہے خوف دردِ دل غمِ کامل نہ بن جائے
رواں سیلاب اشکوں کا زچشمائے محبت ہے
مجھے ڈر ہے کہ یہ دریائے بے ساحل نہ بن جائے

☆

کیا تمہیں وہ بھی زمانہ یاد ہے
گذری اُلفت کا فسانہ یاد ہے

☆

دل دھڑکتا ہے فراقِ یار میں
چشم روتی ہے غمِ دلدار میں

☆☆☆

عبدالرحمٰن ایسنؔ

نام عبدالرحمٰن، تخلص ایسنؔ، پیشہ حکمت، یکم اپریل ۱۹۳۳ء کو قصبہ بنیاں، ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب نے چار شادیاں کیں، ایسنؔ اپنے ماں جائے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے چناں چہ بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت اور غمِ روزگار نے میٹرک سے پہلے ہی ترکِ مدرسہ پر مجبور کردیا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ہجرت کی اور ٹنڈو آدم میں مستقل سکونت اختیار کرلی، مختلف جگہوں اور شہروں میں ملازمت کی غرض سے عارضی قیام بھی رہا، کچھ عرصہ کراچی بھی رہے، ملازمت سے گذر بسر ہوتی دکھائی نہ دی تو باپ دادا کے پیشے کو اپنایا اور ٹنڈو آدم میں اپنا مطب قائم کیا۔ حکمت اور دندان سازی میں مہارت تھی مطب خوب چل نکلا۔ مطالعہ کے شوقین تھے۔ اُردو، سندھی، فارسی اور عربی کا خاصا درک رکھتے تھے۔ جغرافیہ اور فکرِ قرآنی میں وسیع معلومات تھیں۔

شاعری کا شوق ٹنڈو آدم کی ادبی محفلوں اور بیت بازی کے مقابلوں میں شرکت سے ہوا، باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی تاہم ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جس میں وکلاء، حکماء، اطباء، علماء اور ادباء کے ساتھ ساتھ شعرا بھی شامل تھے۔ اُن ہی کو اپنا کلام سنا دیا کرتے اور مشورۂ سخن فرمالیا کرتے تھے۔

غالبؔ، اقبالؔ اور عدمؔ سے متاثر تھے، غزل کہتے تھے۔ مشاعروں میں زیادہ نہیں جاتے تھے، تجردانہ زندگی بسر کی، مختلف امراض نے شاہراہِ زندگی پر رکاوٹیں کھڑی کیں، جگر کے مریض رہے، گردے بھی ناکارہ ہوگئے تھے اس کے باوجود آخری وقت تک چلتے پھرتے رہے۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو انتقال ہوا۔ ٹنڈو آدم میں تدفین ہوئی۔

نمونہ کلام

غزل نمبر۱:

اپنے الطاف کی نظر کر کے مار ڈالا ہے بے بصر کر کے
تیری عظمت کا اعتراف کیا اپنی ذلت کو معتبر کر کے
اپنی تنہائی کی سزا جھیلو ہم فقیروں کو دربدر کر کے
سوئے فتنے جگائے جاتے ہیں بے شعوروں کو باخبر کر کے
زندگانی ہی مختصر کر دی
فکرِ ایتنؔ کو مختصر کر کے

غزل نمبر۲:

وقت کی دیمک چاٹ رہی تھی مجھ کو کب محسوس ہوا
ڈوب گئی جب دل کی کشتی لہروں میں محبوس ہوا
زرد ہوا سورج کا مکھڑا شام کا جب ناقوس بجا
ٹوٹ رہی ہے سانس کی ڈوری، دل بھی لو مایوس ہوا
تم ظاہر بھید چھپاتے ہو اور باطن آگ لگاتے ہو
گل کی بو بن جاتے ہو، تب عاشق پھر سالوس ہوا
اب دھرتی کون سجائے گا جو پریم نہ واپس آئے گا
کیا دھرم فنا ہوجائے گا، کیوں گلشن نامانوس ہوا
جب تاک کی بیٹی آئی تھی، سب اس نے آگ لگائی تھی
وہ سبز قدم ہرجائی تھی، پھر ایتنؔ کیوں منحوس ہوا

☆☆☆

غلام اللہ لغاری مسکینؔ

فقیر غلام اللہ لغاری المتخلص بہ مسکینؔ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں ٹنڈو آدم اور شہداد پور کے درمیان ستیاری کے مقام پر پیدا ہوئے، جاگیردار ہونے کے باوجود فقیرانہ و درویشانہ طبیعت کے مالک تھے، عربی، فارسی، سندھی اور اردو میں مہارت تھی، شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی کام کیا اور ایک کتاب ''نسخہ ترکیبات آدم اور ناصح العارفین'' تصنیف کی۔ اصل میں سندھی کے شاعر تھے مگر اردو میں بھی کہتے تھے لیکن ان کا اردو کلام دست یاب نہیں ہے، ممکن ہے کہ عدم تحفظ کے نتیجے میں ضائع ہوگیا ہو۔ تاہم چند اشعار ملتے ہیں جو قدیم طرز میں ہیں زبان و انداز پر سندھی اور ہندی کا اثر نمایاں ہے، علاوہ ازیں ان چند اشعار اور ان کے سندھی کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیت تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔

۱۹۰۳ء میں انتقال ہوا اور انھیں ستیاری سے متصل مقام سرائے جان محمد میں سپردِ خاک کیا گیا، جہاں ہر ماہ کی ۱۴/ تاریخ کو راگ رنگ کی محفل ہوتی ہے۔

نمونۂ کلام

مسکینؔ ممتا روگ ہے سربھ روگن کی چھاپ
جو بن ممتا چھالیا اس جنم گوایا آپ

مسکینؔ ممتا موہنی سندر اوبی نار
لاکھ چلاوے ہرنیاں بھٹکا دے سنسار

تنا بادل برستا کرتا نت بہار
این و تاں رت میگھ ہے آتم دیکھو یار

☆☆☆

فلکؔ الہ آبادی

شاہ الحق نام، فلکؔ تخلص، الہ آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ۱۹۵۱۔۵۲ء میں شہداد پور آئے اس وقت ان کی عمر چالیس پینتالیس برس کی تھی، زمینداری کرتے تھے، اس کے علاوہ سیاست میں بھی دلچسپی تھی۔ ایک بار بلدیاتی الیکشن میں بھی حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے، افسران سے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ شعر و شاعری کی اچھی خاصی سوجھ بوجھ تھی، شہداد پور کے بزرگ اور اُستاد شعراء میں شمار ہوتے تھے زیادہ تر غزل کہتے تھے لیکن رُباعی کہنے میں بھی کمال حاصل تھا، قدیم رنگ میں کہتے تھے، الہ آباد کے استاد شاعر نوحؔ ناروی سے اصلاح لی۔ اس کے علاوہ میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور داغؔ سے متاثر تھے۔ مشاعرے پڑھتے تھے مل کر اپنی خوش طبیعت کے سبب چراغ محفل سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۷۲ء کے لگ بھگ انتقال ہوا ان کے انتقال کے بعد اہلِ خانہ کراچی منتقل ہو گئے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

کوئی ناز و انداز سے دل میں آئے
بلا سے مری جان جائے تو جائے

جو تیرِ نظر اُس کا پہلو میں آئے
تو خونِ جگر سے وہ گنگا نہائے

فقط دو اک آنسو بہا لیجیے گا
مرے بعد جس دم مری یاد آئے

محبت میں یہ ریت اُلٹی ہے کتنی
کہ آنکھیں لڑیں اور دل چوٹ کھائے

جو تم ساتھ ہو تو ہے دوزخ بھی جنت
نہ ہو تم تو جنت جہنم میں جائے

☆☆☆

قاسم دہلوی

دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد شہداد پور ہجرت کی، اس وقت جوان تھے، اگرچہ محنت کرتے تھے تاہم مستقل روزگار یعنی ملازمت کی تلاش میں تھے لیکن ایسا کوئی موقع ہاتھ نہیں آیا، پریشان رہا کرتے تھے، شاعری کے لیے موزوں طبیعت پائی تھی اس کے علاوہ پروفیسر نعیم تقوی مرحوم جیسے شاعر کی سرپرستی نصیب ہوئی ان کی اصلاح سے فن میں نکھار پیدا ہوا۔ زیادہ تر غزل کہتے تھے۔ میر، غالب اور ذوق سے خاصے متاثر تھے، طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا، انتقال کو ایک عرصہ ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام

کس سے کہوں کہ وعدۂ فردا گزر گیا
لو رُخِ انتظار کا چہرہ اتر گیا

اب مجھ کو اپنے خرمنِ ہستی پہ ناز ہے
یہ شعلۂ فراق بڑا کام کر گیا

مجھ کو سکوں ملا تری زلفوں کی چھاؤں میں
آلامِ روزگار کا چہرہ اتر گیا

تڑپا گئے ہیں چاند ستارے تمام رات
اک بار بھی وہ شوخ اگر بام پر گیا

قاسم دعائے ابر ہوئی اس طرح قبول
بجلی کڑک کے رہ گئی بادل گذر گیا

☆☆☆

قمر ہاشمی

اصل نام سید اسماعیل شہید، جب کہ شہرِ سخن میں قمر ہاشمی کے نام سے مشہور ہوئے، ٹونک میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آ گئے اور NK اکیڈمی (موجودہ شاہ عبداللطیف ہائی اسکول) میں بحیثیت معلم ملازم ہو گئے، چند سال یہاں رہنے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے، جہاں ہمدرد دواخانہ وقف میں ملازمت کر لی۔ زندگی کے باقی دن وہیں گذارے۔

قمر دورِ حاضر کے ایک قادر الکلام شاعر تھے انھوں نے شاعری کی تمام اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، احمد ندیم قاسمی، شان الحق حقی، حکیم محمد سعید، صبا لکھنوی، انجم اعظمی اور مسعود احمد برکاتی سمیت ملک کے کئی منجھے ہوئے ادبا و شعراء نے ان کی فنی صلاحیتوں کا تحریری اعتراف کیا۔

قمر نے ایک عرصے بعد اُردو میں طویل نظم کی روایت کو زندہ کیا، ان کے قلم سے کئی طویل نظمیں تخلیق ہوئیں جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ "دانائی کا آفتاب"، "نروان ساگر"، "ہم رنگِ نفسِ انساں" اور "مرسلِ آخر" وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں "یہ گنبدِ افلاک"، "دیوار دبستان" اور "فسونِ شب کا سفر" سمیت نظم و غزل کے کئی مجموعے ان کی یادگار ہیں جن میں سے کچھ شایع ہوئے اور کچھ کی حسرت دل میں لیے وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کے نوحوں کا مجموعہ "تماشا طلب آزار" ان کی زندگی ہی میں کراچی رائٹرز ایسوسی ایشن رجسٹرڈ کے زیرِ اہتمام ۲۰ رجنوری ۱۹۸۸ء کو شایع ہو کر منظرِ عام پر آ گیا تھا، یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد مجموعہ ہے جس کی تاریخی اہمیت بھی مسلم ہے۔

ان کی بیشتر نظمیں پاک و ہند کے جرائد میں شایع ہو چکی ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک زود گو اور پختہ کلام شاعر تھے، وہ نام وری سے بالکل بے نیاز ہو کر درویشانہ زندگی گذار کے اس دنیا سے چلے گئے، تاہم ان کے قلمی نسخے تاریخ میں انھیں زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کریں گے۔

نمونۂ کلام

شہرِ سکوں

درؔد سعیدی کی قبر پر

دل ہے نہ دل کی کوئی کہانی
تو ہی سنا کچھ اے بے زبانی

خاموش ہیں سب کیسا سماں ہے
عبرت ہی عبرت افسانہ خواں ہے

ویرانیوں کے اُڑتے ہیں پرچم
نغمے نہ جذبے خوشبو نہ ریشم

ناز و ادا کے افسوں نہ عنواں
آتی نہیں یاں بوئے نگاراں

موجِ صبا بھی نوحہ سرا ہے
تاروں کی کشتی مدھم ضیا ہے

مرقد کے اندر ہُوں ہے، نہ ہاں ہے
بس لوحِ تربت نام و نشاں ہے

حرص و ہوس کی خوبو نہیں ہے
جور و سِتا کا جادو نہیں ہے

نخوت نہ غربت تمکیں نہ تیشے
اس دیس میں ہیں طبقے نہ پیشے

سود و زیاں کا سودا نہیں ہے
ذہنوں کا کوئی فتنہ نہیں ہے

روٹھے ہوئے ہو احباب سے تم
کیوں بن گئے ہو اک خواب سے تم

اب کیا سنو گے اب کیا لکھو گے
کس سے دعائیں جینے کی لو گے

اے درؔد اٹھو خوابِ گراں سے
جوہرؔ[1] تمہیں اب لائے کہاں سے

ثروتؔ[2] کو کوئی پیغام دو گے
اپنے قمر کو دشنام دو گے

پوچھو نہ مجھ سے کیا بے بسی ہے
کیوں آدمی کو چپ سی لگی ہے

یہ زندگی ہے کتنی فسردہ
عہدِ بقا بھی حالات خوردہ

☆☆☆

---

[1] جوہر سعیدی

[2] ثروت سعیدی مرحوم ابن جوہر سعیدی

قیصر افغانی

نام نیاز محمد خان اور تخلص قیصر تھا، قیصر افغانی کے نام سے معروف ہوئے، پیشے کے اعتبار سے ویٹرنری ڈاکٹر تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں سانگھڑ آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ اُنہوں نے سانگھڑ شہر میں شاعری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

غزل کے قادر الکلام شاعر تھے۔ مشاعروں کے اہتمام میں خاصی دل چسپی لیتے تھے، سانگھڑ کے علاوہ شہداد پور، ٹنڈو آدم، جھڈو، حیدرآباد، میرپور خاص اور نواب شاہ تک کے مشاعروں میں شاگردوں کے ہمراہ شرکت کرتے تھے، سانگھڑ میں کل پاکستان مشاعروں کا اہتمام کیا، انتہائی فراخ دل، خوش اخلاق اور حد درجہ مخلص انسان تھے، حلقۂ احباب وسیع تھا۔

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ جب تک سانگھڑ میں رہے شعر و سخن کی محافل زوروں پر رہیں۔ ۱۹۸۴ء میں کراچی منتقل ہو گئے جس کے بعد سانگھڑ کی ادبی سرگرمیوں میں قدرے کمی واقع ہو گئی۔

۱۹۹۵ء میں کراچی ہی میں انتقال ہوا، مرحوم کے چھ بیٹے ہیں جن میں تین ایاز خان، ڈاکٹر اعزاز خان اور آفتاب خان ٹیلیویژن کے مشہور مزاحیہ فنکار ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

دنیا والو! یہ نہ سمجھو کھلے ہیں آج سوالی ہاتھ
جس نگری سے کل آیا تھا اب جاتا ہوں خالی ہاتھ

اور کسی کی جانب اب تو ہاتھ بڑھانا مشکل ہے
اس کے جیسے دیکھے کہیں ہیں میں نے اور مثالی ہاتھ

دل کو میرے تنہائی میں ڈھارس سی ہو جاتی ہے
سینے پر محسوس کیا ہے جب بھی ایک خیالی ہاتھ

وہ جو نہیں تو تنہا کیوں کر خوشیوں کا اظہار کروں
کوئی بتائے کیسے بجائے ایک اکیلا تالی ہاتھ

حسن چمن میں اس کو دیکھا قیصرؔ کیا تعریف کروں
سرو کی صورت قد و قامت اور لچکی ڈالی ہاتھ

غزل نمبر ۲:

بنا کے حسن کو پھولوں کا تاج دینے لگا
میں مملکت میں تھا اس کی خراج دینے لگا

کوئی بتائے کہ کس کس پہ اب عمل کیجے
زمانہ روز جنم اک رواج دینے لگا

یہ کاشت کار کی محنت کا ہی نتیجہ ہے
جو کھیت پہلے تھا بنجر اناج دینے لگا

یہ زہر کس نے پلایا ہے مجھ کو چارہ گرو
یہ فائدہ مجھے کس کا علاج دینے لگا

بڑے خلوص سے قیصرؔ کل ایک دیوانہ
مجھے حکومتِ بے تخت و تاج دینے لگا

☆☆☆

محمد اسماعیل صادقؔ ریواڑوی

مولانا محمد اسماعیل المتخلص بہ صادقؔ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے شہر ریواڑی (صوبہ ہریانہ) میں پیدا ہوئے، اجداد مویشیوں کا کاروبار کرتے تھے، مشکل سے آٹھ درجے پاس تھے تاہم مطالعہ وسیع تھا، وہ کچھ عرصہ "جبل پور" میں بھی رہے جہاں انھوں نے اپنے دوست انوار الحق جو اُن دنوں وہاں ڈپٹی کمشنر تھے کے تعاون سے بڑے پیمانے پر کل ہند مشاعرے منعقد کرائے جن میں جگرؔ مراد آبادی، حفیظؔ جالندھری، جوشؔ ملیح آبادی، مولانا ماہر القادری، فراقؔ گورکھپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی اور دیگر صفِ اوّل کے شعرأ شریک ہوتے رہتے تھے ان مشاعروں کی نظامت کے فرائض وہ خود انجام دیا کرتے تھے۔ سیاست میں بھی دل چسپی لیتے تھے بحیثیت مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے تحریکِ پاکستان میں گرمجوشی سے حصہ لیا، خاکسار تحریک میں بطور سالار خدمات انجام دیں۔ قیامِ جبل پور کے دوران وہاں کی ترقی پسند تنظیم "فری تھنکرز فورم" کے رکن بھی رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد چند دن ملتان اور رحیم یار خان میں گذارنے کے بعد مستقل طور پر شہداد پور آ گئے جہاں ان کے شعر و فلسفہ کا بہت چرچا ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے نو آموز شعرأ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور ان سے اصلاح لینے لگے۔

مولانا کے معاشی حالات دگرگوں ہی رہے، شہداد پور میں پھیری لگا کر بسکٹ اور کیک فروخت کیا کرتے تھے کچھ عرصہ خالی بوتلیں بھی خریدا کرتے تھے، چلتے پھرتے فلسفہ و شعر پر بحث کرتے اور لوگوں کو صدقِ مقال اور اکلِ حلال کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ادب، اسلامیات، فلسفہ اور تاریخ پر گھنٹوں گھنٹوں بولتے رہتے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے اور بے پناہ داد وصول پاتے، کسی حد تک غالبؔ سے متاثر تھے لیکن پیار سے ان کا ذکر "غالبؔ بد معاش" کہہ کر کیا کرتے۔ غالبؔ کی طرح ان کے ہاں بھی تراکیب کا استعمال پایا جاتا ہے، بعض جگہوں پر انتہائی مشکل لفظوں کو بڑی ہی خوب صورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے، اس بزرگ شاعر نے ۷ر جون ۱۹۹۰ء کو دنیا والوں سے پردہ کیا۔ شہداد پور میں تدفین عمل میں آئی۔

نمونۂ کلام

غزل:

ہر ایک سوز کو ساز حیات رہنے دے
حیات اپنی سمندر صفات رہنے دے

مرے مزاج مشقت پسندی کی خاطر
نہ کرنہ کر یری حل مشکلات رہنے دے

مشاہدات کی دنیا میں جا ثریا تک
الٰہیات کو ایمانیات رہنے دے

شعور حسن پہ وجدانِ ذات پیدا کر
خرد کو جو طلسم صفات رہنے دے

حریف جلوہ مذاقِ نظر کو رکھ صادقؔ
اگر ہو۔ مات مسلسل تو مات رہنے دے

نظم زندگی کے چند اشعار

خود محافظ خود محیطِ بیکراں ہے زندگی
ساز بے آواز ہے، سوز نہاں ہے زندگی

ضابطِ کل، ثابت و سیارگاں ہے زندگی
درحقیقت سلکِ نظم کہکشاں ہے زندگی

نیم خفتہ ہے نباتات اور گل شاداب میں
حاملِ نشوونما، حیرت نشاں ہے زندگی

اور حیوانات میں پا کر بتدریج ارتقاء
حضرتِ انسان کے شایانِ شاں ہے زندگی

ہفت صد ہفتاد، قالب دیدہ ام کی ترجمان
ہیں مواليد ثلاثہ جسم، جاں ہے زندگی

صورت و عادات کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر مدام
اِک تنازعِ للبقا کی داستاں ہے زندگی

راکب اس کا صاحب کردار ہو صادقؔ تو پھر
مرکب عظمت نشاں زیرِ عناں ہے زندگی

☆☆☆

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں محمد اسماعیل احمدانی ایڈووکیٹ ساگھڑ کے چند مضامین مطبوعہ مجلہ ''شہر سوتی شہداد پور'' (نومبر ۱۹۹۱ء) سے استفادہ کیا گیا۔

محمد حسین سحرؔ

محمد حسین المتخلص بہ سحرؔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو پیلی بھیت، یو پی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا، ۱۹۴۷ء میں شادی کی، پاکستان آئے اور شہداد پور میں بس گئے، اولاد میں نو بیٹے بیٹیاں ہیں جو سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں، مختلف مقامات پر ملازمت کی جن میں پیلی بھیت شوگر مل (بطور سپروائزر)، پاکستان ریلوے، بلڈنگ سپرویژن، نقشہ نویسی اور اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان شامل ہیں۔

شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا، پیلی بھیت میں شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے، منشی عبدالحمید حمیدؔ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ پیلی بھیت میں قیام کے دوران چند ایک بار آل انڈیا مشاعروں میں کلام پڑھا۔ شہداد پور میں "بزم سحرؔ" قائم کی جس کے تحت کئی ادبی محافل و مشاعرے منعقد کرائے۔

غزل کہتے تھے۔ ان کا اولین مجموعہ، ان کے بیٹے پروفیسر کوثر اقبال نے "نقشِ سحرؔ" کے عنوان سے مرتب کر کے ان کی ساتویں برسی پر "بزم سحرؔ" شہداد پور کے تحت شائع کیا۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

یہ کرم اُن کا مجھ پہ کیا کم ہے | درد ہے دل میں اور پیہم ہے
بزمِ ساقی ہے ساغرِ جم ہے | توبہ کے توڑنے میں کیا غم ہے
جاں تو پروانے خود ہی دیتے ہیں | شمع کیوں رو رہی ہے کیا غم ہے
دل پہ گزرے گا حادثہ کوئی | درد ہے تو مگر بہت کم ہے

اُٹھو تعظیم کو سحرؔ اس کی
یہ جو انساں ہے، فخرِ آدم ہے

غزل نمبر۲:

نقشِ پا پر ترے جبیں ہوتی | یہ عبادت بڑی حسیں ہوتی
آج وہ بے حجاب ہے تو ہمیں | تابِ نظارگی نہیں ہوتی
روز و شب گر نہ ملتے آپس میں | زلف عارض کے کیوں قریں ہوتی
اے قضا کاش وقتِ آخر ہی | اُن کے در پہ مری جبیں ہوتی

محسن آمادۂ کرم ہے سحرؔ
ہم سے ہی آرزو نہیں ہوتی

☆☆☆

محمد رمضان صوفی

۱۹۰۶ء میں ریاست الور (بھارت) کے قصبہ گوبند گڈھ میں پیدا ہوئے، قرآن پاک کے چندرہ پارے حفظ کیے اور دینی مدارس ہی سے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھی، باقاعدہ پڑھے لکھے نہیں تھے، خط بھی پختہ نہ تھا، ان کی بیاض میں خط کے مختلف نمونے ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند مخلص دوست ان کی اس مشکل کو آسان کردیا کرتے تھے یعنی موصوف اپنا کلام انھیں املا کروادیا کرتے ہوں گے۔

شعروشاعری کا شوق ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ احمد آباد (بھارت) کے چند شعرأ کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے اور ان کے ساتھ مشاعرے سننے سے ہوا، ۱۶۵ کی تعداد میں غزلیں، کِکلی، رسیا، نعت، حمد، نظم، سہرا اور مرثیہ وغیرہ کے عنوان سے کلام ان کی ڈائری میں درج ہے جو ان کے پوتے کے پاس محفوظ ہے۔

بھارت میں بڑودہ، میاں داتار اور اجمیر شریف کے مشاعرے پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں ہجرت کی اور ٹنڈوآدم آ گئے جہاں ان کا اکلوتا بیٹا پہلے ہی ہجرت کر کے آ چکا تھا، ٹنڈوآدم آنے کے بعد انجم بدایونی کو باقاعدہ استاد تسلیم کرلیا اور ان سے اصلاح لینے لگے، یہاں کے مقامی مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے مل کر اپنے مخصوص لب ولہجہ اور مزاحیہ شاعری کی بناء پر ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں ٹنڈوآدم میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

زندگی کیلئے کردار کو پہنچی تو سہی
خود پرستی رسن و دار کو پہنچی تو سہی

حد سے گذری تو سہی شدتِ احساس جنوں
وحشتِ دل ترے معیار کو پہنچی تو سہی

ظلمتِ شب سحر آثار ہوئی تو آخر
زلفِ مشکیں گلِ رخسار کو پہنچی تو سہی

گو کہ وہ بات نہیں پھر بھی نسیمِ سحری
رفتہ رفتہ تری رفتار کو پہنچی تو سہی

تم کو آغازِ محبت ہو مبارک صوفی
دل کی حسرتِ دیدار کو پہنچی تو سہی

غزل نمبر ۲:

وہ کہتے ہیں تم کو جلایا کریں گے
رقیبوں کی محفل میں جایا کریں گے

وہ اب تیغِ ابرو چلایا کریں گے
نگاہوں کی برچھی لگایا کریں گے

مجھے خونِ دل چاہیے آج اے دل
وہ دستِ حنائی رچایا کریں گے

سرِ بزم خاموش رہ کر بھی ان کو
محبت کے قصے سنایا کریں گے

یہ طے کرلیا ہم نے دل سے اے صوفی
غزل لکھ کے اُن کو سنایا کریں گے

☆☆☆

مسعود احمد عزیز

مسعود احمد نام، عزیز تخلص بھی تھا اور عرفیت بھی۔[1] ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۰ء کو ٹونک راجستھان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں منشی اور ۱۹۳۲ء میں کامل کا امتحان الٰہ آباد سے پاس کرنے کے بعد سعادت ہائی اسکول نیا بیڑہ (پرگنہ ٹونک) میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۴۷ء میں دربار ہائی اسکول ٹونک میں تبادلہ ہوا جہاں ۱۹۵۰ء تک فائز رہے پھر تن تنہا پاکستان ہجرت کی، چھ یا سات ماہ ٹنڈو الٰہیار میونسپلٹی میں ملازمت کی بعد ازاں سرسید ہائی اسکول ٹنڈو آدم سے منسلک ہوئے جہاں سے ۱۹۸۰ء میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہوگئے۔

زندگی پُر آشوب گذری، رنج و آلام اور مصائب سے خاص یارانہ رہا۔ ابھی تین ماہ کے ہی تھے کہ آغوشِ مادری سے محروم ہوگئے، ماں کی رحلت کے بعد پرورش کے فرائض پھوپھا، پھوپھی نے انجام دیے۔ ان کے والد صاحب اگرچہ ۱۹۵۹ء تک حیات تھے مگر ہمیشہ اُن کی شفقت سے محروم ہی رہے، بہت کم ملنا ہوا، پوری زندگی میں کل چھ یا سات مرتبہ ملاقات رہی، والد صاحب اور پھوپھا پھوپھی نے ہجرت نہیں کی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں اپنے والد صاحب سے ملاقات کی غرض سے بھارت گئے اور ایک ماہ اُن کے پاس گذارا، یہ ان کی اپنے والد سے زندگی کی طویل ترین ملاقات تھی۔

۱۹۵۸ء میں شادی ہوئی، اولاد میں چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹا مشہود عزیز ڈیڑھ سال کی عمر میں انتقال کر گیا تھا۔

موصوف ۱۹۸۷ء میں فالج کے حملے کی بنا پر چلنے پھرنے سے بھی رہ گئے تھے۔ ۲۰ رمارچ ۱۹۹۵ء کو کراچی میں زیرِ علاج تھے کہ انتقال ہوا اور نیو کراچی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

شعر فہمی کا شوق ٹونک کی ادبی محافل میں شرکت کرنے سے ہوا، تاہم اپنے فارسی کے استاد مولوی احمد شاہ اور احمد سعید خان عاشق کی تحریک پر ۱۹۳۳ء میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کیے، استاد عاشق جو کہ داغ مرحوم

---

[1] عرفیت والدہ کی طرف سے تھی جسے بعد میں بطور تخلص اختیار کر لیا۔

کے شاگرد تھے۔ ۱۹۳۰ء تک شرف تلمذ رہا پھر استاد کا انتقال ہو گیا اس کے بعد انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ غالب اور اقبال سے بے حد متاثر تھے۔ اُن کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا کرتے تھے، فن شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر بھی دسترس تھی رسالہ "جمہوریت" میں ان کے افسانے تواتر کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے تحقیقی کام بھی انجام دیا، علم العروض پر دو کتابیں بھی تصنیف کیں جو ہنوز طباعت سے محروم ہیں، لگ بھگ پانچ سو غزلیات پر مشتمل ان کا دیوان بھی منتظر طباعت ہے۔ ان کے بیٹے سرور عزیز جو خود بھی شاعر ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

تری طلب میں گئے، یاس در کنار آئے کہ ہم تجھے حرم و دیر میں پکار آئے
بہار نام ہے اے دوست تیری آمد کا خدا کرے کہ ترے گھر تو بار بار آئے
تمھاری یاد میں ہم میکدے میں پیتے رہے بڑے مزے سے شبِ غم وہاں گزار آئے
تم اور دعویٰ ایفائے عہد کیا کہنا کرو وہ بات کہ جس کا کچھ اعتبار آئے

عزیزؔ گردشِ دوراں سے ہم نہیں ڈرتے
جو اس کو آنا ہے آئے ہزار بار آئے

غزل نمبر ۲:

مسیحائی کا دم بھرتے ہیں کیا کیا ہمارے درد کی بھی ہے دوا کیا
کہیں تم سے ہم اپنا مدعا کیا تمھیں سوچو کہ ہے شانِ عطا کیا
بس اک رنگیں تبسم اُن لبوں پر ہمارے خون کا ہے خوں بہا کیا
تمھیں تھے رونقِ کاشانۂ دل نہیں ہو تم تو پھر دل میں رہا کیا
اگر ترکِ جفا کا ہے ارادہ تو کارِ نیک میں ہے سوچنا کیا
بجز اس کے کہ اب پچھتا رہے ہیں ہمیں برباد کرکے جل گیا کیا

عزیزؔ ان سے بجا ترکِ تعلق
ارے نادان تو نے یہ بکا کیا

☆☆☆

نعیم حیدر تقوی

۱۹۶۳ء میں جب شہداد پور کالج کا قیام عمل میں آیا تب وہاں اُردو کے پروفیسر کے طور پر اُن کا تقرر ہوا چناں چہ اسی سبب سے ۱۹۷۳ء تک وہاں عارضی قیام رہا بعدازاں میر پور خاص اور پھر چند ہی عرصوں بعد کراچی تبادلہ ہو گیا۔

وہ نہ صرف شاعر بلکہ بلند پایہ مصنف و تنقید نگار بھی تھے، فنِ شاعری اور اس کی تکنیک پر اُن کی گرفت مضبوط تھی، اُردو کے ساتھ ساتھ سندھی، انگریزی، عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے چناں چہ انھوں نے ان تمام زبانوں ہی میں طبع آزمائی کی۔ سندھی اور اُردو میں تو صاحبِ دیوان ہیں۔ شہداد پور کے حوالے سے بھی فروغِ ادب میں ان کی خدمات قابلِ صد تحسین ہیں، وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں ان کا نام آج بھی نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کے بیسیوں شاگرد آج بھی شعر و ادب کی شمع کو فروزاں رکھنے میں کوشاں ہیں، وہ جب تک یہاں رہے چمنِ شعر و سخن میں پھول کھلاتے رہے۔ وہ سندھی اور اُردو بولنے والوں میں باہمی رواداری اور محبت کے خواہاں تھے اسی لیے انھوں نے سندھی اُردو اشتراک اور تعاون پر زور دیا، کئی سندھی اُردو مشاعرے منعقد کرائے۔ سندھی اُردو شعرا کا منتخب کلام شائع کیا اور مشہور سندھی شعرا کے کلام کے اُردو تراجم شائع کیے۔ ان کے دم سے نہ صرف شہداد پور کی علمی و ادبی محفلوں کو چار چاند لگے بلکہ پورے ضلع میں شہداد پور کے شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

اُن کی تصانیف تیس کے لگ بھگ ہیں جو اُردو کے علاوہ سندھی، عربی اور انگریزی زبانوں میں ہیں، بادۂ عرفان، کہکشاں، دھنک رنگوں کی، مثنوی صبحِ یقین، مہران رنگ اور مہران کے پھول قابلِ ذکر ہیں۔ فنِ تنقید کے حوالے سے تنقیدی تجزیہ، تنقید و تناظر، تنقید و تعبیر، تنقید و آگہی اور کلیاتِ افضل اور فارسی کے مشہور شعرا شامل ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر۱:

روشنی ہوں اس لیے آوارگی میں قید ہوں　　ایک مدت سے میں کرب آگہی میں قید ہوں
لمحہ لمحہ پیش کرتا ہوں جواز زندگی　　ہے شکست و ریخت ایسی ریزگی میں قید ہوں
پہلے اس کی آرزوئے دید میں محبوس تھا　　چاند کو دیکھا ہے جب سے چاندنی میں قید ہوں
میں تو آزادی سے دانستہ سہا کرتا ہوں غم　　اپنی مرضی سے تمنائے خوشی میں قید ہوں
کیا سبب ہے آج خود پہ دسترس مجھ کو نہیں　　بحر ہستی ہو کے بھی میں تشنگی میں قید ہوں

کیا ہوا تقوؔی انا کو، قدریں کیا ہوئیں
کس لیے میں ایک کم تر آدمی میں قید ہوں

غزل نمبر۲:

اے دوستو! تم نے کبھی اتنا نہیں سوچا　　کندھوں پہ کھڑے ہونے سے قد بڑھ نہیں سکتا
بیدار اگر آنکھیں ہوں پھر خواب ہے کیسا　　اک لمحہ بھی اوجھل نہ ہوا ہے ترا چہرہ
بے ربط لکیریں ہیں مقدر کے افق پہ　　میں ایسی پہیلی ہوں کسی نے نہیں بوجھا
ہیں بکھرے ہوئے خاک پہ لاکھوں یہاں تارے　　یکتا ہوں تو اک کاہکشاں اور ہو پیدا
ہے چودھویں کو چاند کا مقسوم مقدر　　آرام کرے اس کا کبھی بس نہیں چلتا
جو خاک تھی قدموں تلے اس سے اٹے چہرے　　ہر ایک کو تحفہ یہ ملا راہ ہوس کا

اس بات پہ سب لوگ خفا مجھ سے ہیں تقوؔی
جو بات ہو کہنے کی وہ دل میں نہیں رکھتا

☆☆☆

نیاز احمد دلؔ وارثی

سید نیاز احمد نام، دلؔ تخلص، سلسلۂ وارثیہ سے نسبت، ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۶ کو قرولی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ راجپوتانہ بورڈ سے میٹرک، الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایڈوانس اُردو اور پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ قیام پاکستان سے قبل پانچ سال تک جھنجھو (جے۔پور) کے ہائی اسکول میں معلم اور گیارہ سال تک پولیس میں منشی رہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ٹنڈو آدم آ گئے اور بلدیہ ٹنڈو آدم میں ملازمت اختیار کر لی، دو شادیاں کی تھیں، دونوں بیویوں سے اولاد ہے۔

گھریلو حالات انتہائی کسمپرسی میں گزرے، ان حالات میں بھی شعر و سخن کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ محفلِ سماع کے شوقین تھے، خود بھی محفلیں منعقد کرایا کرتے تھے۔ دردؔ سعیدی، وفاؔ عزیزی اور سفیرؔ گلشن آبادی سے ملاقات رہتی تھی، غزل کہتے تھے۔

۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء کو ان کا انتقال ہوا اور ان کی دوسری بیوی قبول بیگم نے مقبرہ تعمیر کرایا۔

نمونۂ کلام

سراپا ستم ہو، سراپا جفا ہو
خدا کی قسم، تم بڑے بے وفا ہو
بڑے خوش لقا ہو، بڑے خوش ادا ہو
خدا جانے کیا ہو جو تم باوفا ہو
سلامت ہے جب تک شعورِ محبت
خفا ہی رہو تم جو ہم سے خفا ہو
جو دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹے بلا سے
ستم پر ستم ہو، جفا پر جفا ہو
نیازؔ اُن سے آنکھیں لڑانے چلے ہو
کبھی یہ بھی سوچا کہ تم چیز کیا ہو

☆☆☆

وفاؔ عزیزی قرولوی

نام عبدالروف، التخلص بہ وفاؔ، عزیزی کنیت ١٩٠٨ء میں قرولی راجستھان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے قرولوی بھی لکھتے تھے۔ منشی، ادیب، فاضل تک تعلیم حاصل کی۔ ١٩٣٨ء میں چند دوستوں کے ہمراہ ہجرت کی، نوشہرو فیروز میں چند ماہ گذارنے کے بعد ٹنڈو آدم آئے۔ ١٩٣٩ء میں بھارت سے اپنے اہل خانہ کو بلوایا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ١٩٧٩ء میں انتقال ہوا، ٹنڈو آدم میں مدفون ہیں۔

ذوق شعرگوئی طالب علمی کے دور میں پیدا ہوا۔ اُردو اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ اصل میں غزل گو تھے تاہم حمد، نعت، مسدس، نظمیں اور منقبت وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ صابرؔ رائے پوری اور مولوی عبدالعزیز کے شاگردوں جبکہ دردؔ سعیدی، سفیرؔ گلشن آبادی اور جوہرؔ سعیدی کے احباب میں شامل تھے۔

زندگی انتہائی نامساعد حالات کا شکار رہی، جس کی بنا پر اولاد بھی تعلیم حاصل نہیں کرسکی، اس کے باوجود انتہائی باحوصلہ اور خوددار شخص تھے، حالات کی ستم ظریفیوں کا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا تاہم ان کے اشعار ان کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں، اپنی زندگی میں "سیدِ گل" کے نام سے جیبی سائز میں ایک کتابچہ شائع کیا جس میں ان کے منتخب اشعار، قطعات، رباعیات اور چند ایک غزلیات شامل تھیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں کلام کو اشاعت کی غرض سے جمع کیا تھا مگر زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ اس کی تمنا دل میں لیے

چلے گئے۔ وفات کے بعد ایک صاحب (جو اُن کے دوست بھی تھے) بغرض تعزیت ان کے گھر آئے اور ان کے صاحبزادوں سے تمام کلام یہ کہہ کر تھیالے گئے کہ اس کی اشاعت کا بندوبست کریں گے مگر اس کے بعد آج تک نہ تو اُن صاحب کا کچھ پتا چلا اور نہ ہی دیوان کا۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

حسن خود محوِ تماشہ ہوگا عشق معراج پہ پہنچا ہوگا
بھول جائیں گے گلستاں والے صحرا صحرا مرا چرچا ہوگا
موسمِ گل ہی کسی دن شاید ایک رنگین سا دھوکا ہوگا
اعتبارِ غمِ ہستی کے لیے اک حسیں، خواب سا دیکھا ہوگا
کون دیکھے گا وفاؔ ساحل سے
موج در موج سفینا ہوگا

غزل نمبر ۲:

جن اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے انساں ہوں گے
وہ اندھیرے ہی کبھی رشکِ چراغاں ہوں گے
خود بہاروں نے کیے کتنے گلستان تاراج
اور تاراج ابھی کتنے گلستان ہوں گے
ہم سے بدلی ہوئی دنیا کی نگاہیں ہوں گی
ہم سے دیوار کے سائے بھی گریزاں ہوں گے
سلسلہ رکھتے ہیں ہم دار و رسن سے اپنا
ہم ترے بس کے نہ اے گردشِ دوراں ہوں گے
بحرِ ہستی میں مجھے غرق ہی رہنے دیجیے
میں جو اُبھرا تو بپا سیکڑوں طوفاں ہوں گے

☆☆☆

باب دوم

جلوۂ گل

ازل ہی سے چمن ہجر محبت
کسی نے رنگیاں دکھلا رہا ہے
کھلی کوئی جہاں پہ کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے
(انجم)

تمہید

یہ باب ۵۳ شعراء اور ۵ شاعرات کے تذکرے اور کلام پر مبنی ہے۔ ۱۹۹۶ء میں جب یہ مقالہ لکھا گیا تب یہ تمام شعراء بقیدِ حیات تھے تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کچھ شعراء نے اس قیدِ حیات سے رہائی پا کر عدم آباد کی شہریت حاصل کر لی۔ اس خیال سے کہ اصل تذکرے کی ترتیب میں فرق نہ آ جائے، ان مرحومین کا تذکرہ اسی باب میں اُسی ترتیب سے رکھا گیا ہے جس ترتیب سے اصل قلمی نسخہ میں موجود ہے تاہم تازہ ترین معلومات کو حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔ بعض شعراء و شاعرات کے ترکِ سکونت اور ادبی منظرنامے سے گم نامی کی بنا پر ان کے بارے میں تازہ ترین معلومات کا حصول بھی ایک مسئلہ ثابت ہوا۔ ان شعراء و شاعرات سے رابطے اور ان کے بارے میں تازہ اطلاعات کے حصول کی کوششیں جاری ہیں جس کا اضافہ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں کر دیا جائے گا۔

اختر سعیدی

سید اختر علی نام، اختر تخلص، دادا استاد بسمل سعیدی کی نسبت سے سعیدی لکھتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ اختر سعیدی خاندانی شاعر ہیں۔ باپ، دادا، چچا اور بھائی سب ہی نے شعر کہے، ان کے شعری ذوق کی پرورش و نشو و نما ثروت سعیدی مرحوم کی برادرانہ شفقت اور والد گرامی جوہر سعیدی کی سرپرستی میں ہوئی۔ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ پہلا مشاعرہ پڑھا، ابتداء میں اسماعیل انیس سے اصلاح لی، بعد میں والدہ کے توسط سے ایک غزل والد صاحب تک پہنچائی، حوصلہ افزائی ہونے پر باقاعدہ طور پر والد صاحب کے حلقۂ تلمذ میں آ گئے۔

اختر کی عملی زندگی کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی ہیں، ان کی صحافیانہ زندگی کا آغاز ۱۹۷۸ء میں روزنامہ "جسارت" کراچی، کی ہفت وار ادبی ڈائری "روشنیوں کا شہر" سے ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں روزنامہ "حریت" کراچی میں چلے گئے، اس دوران اسلامک سینٹر پریس سے جاری ہونے والے رسالے "اذان" کے لیے ماہوار کالم "سلسلۂ روز و شب" لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۸۵ء سے اب تک روزنامہ "جنگ" کراچی سے منسلک ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی تقریبی سرگرمیاں بھی عروج پر ہیں۔ بحیثیت صدر فکرِ نو کراچی اور نگراں بزم کلچرل ویلفیئر سوسائٹی کراچی انھوں نے بہت کام کیا ہے اور کرتا جوز کر رہے ہیں۔

شاعری میں ان کی محبوب صنف غزل ہے۔ وہ میر کے معتقد ہیں اور اُسے اپنا رہنما مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں ابن انشاء، ناصر کاظمی، رسا چغتائی، عبید اللہ علیم، شاہد عشقی اور پیرزادہ قاسم سے بھی متاثر ہیں۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام "چراغ جلنے تک" چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے جس کو اہل علم سے بے پناہ داد بھی وصول کر چکا ہے۔

---

1 دوسرا مجموعہ "فراق سے وصال تک" ۲۰۰۰ء جب کہ تیسرا مجموعہ "ہوا، چراغ، آئینہ" ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

ہے جس کی طلب وہ مرے گھر تک نہیں آیا
مجھ کو ابھی جینے کا ہنر تک نہیں آیا
اب دشت میں سائے کے طلب گار کہاں جائیں
اس بار تو سایہ بھی شجر تک نہیں آیا
آنکھوں میں جو محفوظ امانت کی طرح ہے
وہ اشک ابھی دیدۂ تر تک نہیں آیا
آخر تو کبھی رکتا نہ تھا رات گئے تک
کیا بات ہوئی آج سحر تک نہیں آیا

غزل نمبر ۲:

زمانے کی توجہ ہٹ گئی ہے
محبت فاصلوں میں بٹ گئی ہے
میں بند اب تک حصار ذات میں ہوں
انا میرے مقابل ڈٹ گئی ہے
جنونِ شوق پہنچا ہے وہاں تک
جہاں تک بھی تری آہٹ گئی ہے
درِ امکانِ شب وا ہے ابھی تک
بظاہر تیرگی تو چھٹ گئی ہے
رہوں کب تک جہانِ مصلحت میں
مرے جذبوں کی قیمت گھٹ گئی ہے

☆☆☆

اختر عادل

۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اُردو اور بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں اور مولانا محمد علی جوہر میونسپل ہائی اسکول کے پہلے صدر مدرس ہیں، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ آپ اس ادارے کے بانیوں میں سے ہیں، کیوں کہ آپ نے اس ادارے کے لیے قربانیاں دی ہیں، یہاں تک کے اپنی سرکاری نوکری چھوڑی، جس کا یقیناً آپ کو نقصان ہی ہوا۔

نہایت سنجیدہ مزاج، فصیح و بلیغ لہجہ اور ذہین شخصیت کے مالک ہیں۔ معاشی طور پر مناسب و متوسط زندگی بسر کر رہے ہیں۔ صاحب اولاد ہیں اور تمام بچے زیور تعلیم سے آراستہ ہیں۔

۱۹۶۳ء سے شعر کہتے آ رہے ہیں اگرچہ حمد و نعت وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے تاہم زیادہ تر غزل کی زلفیں سنوارنے میں مشغول ہیں، شاعری میں غالبؔ، اقبالؔ اور سفیر گلشن آبادی سے متاثر ہیں۔ سفیر گلشن آبادی اور مسعود احمد عزیزؔ سے تلمذ تھا۔ میرؔ، حالیؔ، حسرتؔ، فرازؔ اور قمر جلالوی کو بھی پسند کرتے ہیں۔ حلقۂ احباب وسیع ہے۔ ماضی میں، ادب کے فروغ کے لیے متحرک اور سرگرم رہے ہیں، آج کل بھی مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔

میں اپنے لیے یہ اعزاز سمجھتا ہوں کہ ابتدا میں ایک دو بار اپنے کلام پر ان سے اصلاح لی ہے۔ جوہر ہائی اسکول میں تعلیم کے دوران ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اچھے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

جہاں میں دل لگانے کا یہی انعام ٹھہرا ہے
الم آغاز ٹھہرا ہے، اجل انجام ٹھہرا ہے
کیا کرتا ہوں اپنی شوخئ تقدیر کا شکوہ
خوشی کا وقت مجھ پر باعثِ آلام ٹھہرا ہے
طریقے جس نے صرفِ زندگی کرنے کے سکھلائے
وہ سب سے افضل و اعلا یہی اسلام ٹھہرا ہے
نہ مجھ کو خوف محشر کا نہ غم نارِ جہنم کا
کہ بعد از حق زباں پر مصطفیؐ کا نام ٹھہرا ہے
نہ پایا منزلِ مقصود کا کوئی نشاں عادلؔ
کہ منزل کا خیال آنے پہ ہر ہر گام ٹھہرا ہے

غزل نمبر ۲:

کوئی رہبر نہ ہمسفر اور میں تنہا تنہا
زندگی کا یہ سفر اور میں تنہا تنہا
دن ڈھلا ہے تو پھر رات بھی آجاتی ہے
بے کسی شام و سحر اور میں تنہا تنہا
عشرتِ زیست کہاں ہے؟ غمِ دوراں کیا ہے؟
کچھ پتہ ہے نہ خبر اور میں تنہا تنہا
جگمگاتے ہوئے اس شہر میں عادلؔ اپنا
کتنا تاریک ہے گھر اور میں تنہا تنہا

☆☆☆

ارشدؔ جالندھری

ارشدؔ جالندھری کا اصل نام محمد رمضان تھا۔۱۹۳۳ء میں بھارت کے شہر جالندھر (ریاست کپورتھلہ) میں پیدا ہوئے۔قیامِ پاکستان کے بعد اہلِ خانہ کے ہمراہ ہجرت کرکے بہاول پور آ گئے جہاں سے گریجویشن کیا۔دورانِ تعلیم بہاول پور میں بحیثیت شاعر پہچانے جانے لگے،کالج سمیت شہر میں بے شمار مشاعرے پڑھے۔اسی کالج کی جانب سے انھیں شاعر ہونے کی اعترافی سند بھی ملی۔

شاعری کا شغف میٹرک کے زمانے ہی سے ہے،موزوں طبیعت پائی ہے،قدیم و جدید شعرا کو پڑھا،مختلف کتب کے ذریعے علم العروض اور فنِ شاعری سے مکمل واقفیت حاصل کی،باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی،موصوف کے بقول ان کے ہم عصر اور سینئر شعراء خود ان سے مشورۂ سخن فرماتے تھے۔۱۹۷۲ء میں بہاول پور سے ترکِ سکونت کرکے اکیلے ہی ٹنڈو آدم آ گئے[1] اور اس شہر کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔تنویر ٹیکسٹائل مل اور بالا کام کاٹن فیکٹری میں بطور مکینک وابستہ رہے۔

---

[1] نامعلوم وجوہات کی بنا پر گھر بار چھوڑ چھاڑ کر ٹنڈو آدم میں آ بسے اور مدت تک یہاں کسی کو اپنے بارے میں اطلاع تک نہیں دی۔آخری عمر میں خاندان کے لوگوں نے انھیں تلاش کر لیا اور اپنے ساتھ بہاول پور لے جانا چاہا لیکن باوجود کوشش اور منت سماجت کے ان کے ہمراہ نہیں گئے۔کئی برس بعد اپنے بڑے بھائی کی بیماری کی خبر پا کر بالآخر وہاں گئے۔اس کے بعد چند برسوں تک آنا جانا رہا پھر وہیں اپنی ہمشیرہ کے پاس رہنے لگے جہاں ۱۴ اگست ۲۰۰۰ء کو انتقال ہوا۔

شاعری کی تقریباً تمام ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم، مسدس، نعت اور حمد کہنے میں جواب نہیں رکھتے۔ تاہم زیادہ تر غزل ہی کہتے ہیں۔ ان کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ موصوف اپنا کلام نوٹ نہیں کرتے، مشاعروں میں بھی طویل سے طویل کلام زبانی سناتے ہیں۔ حافظے کا یہ عالم ہے کہ موصوف کو اپنے ابتدائی دور سے اب تک کی زیادہ تر غزلیں زبانی یاد ہیں، ان کے پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے۔ لہجہ پنجابی ہے، جس سے بول بے حد شیریں ہو جاتے ہیں۔ دھیمے لہجے اور تخیل کی گہرائی میں ڈوب کر سامعین پر سرور و کیف کی سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ مشاعروں میں عموماً سامعین کی خاص توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ اُردو کے علاوہ سرائیکی اور پنجابی زبانوں میں بھی شعر کہتے ہیں، لیکن بہت کم۔

شاعری میں خلاف اُصول بات پسند نہیں کرتے۔ ان کا شمار ضلع ساہنگھڑ کے ان چند ایک اساتذہ اور کہنہ مشق شعراء میں ہوتا ہے جو نہ صرف بھرپور شعر کہتے ہیں بل کہ مسلسل کہتے ہیں۔

راقم الحروف کو ان سے فیض یاب ہونے اور وقتاً فوقتاً مشورۂ سخن لینے کا شرف حاصل ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

گلستاں میں پھول بھی کھلتے رہے
خوشبوؤں کے شہر بھی بستے رہے
شب پرستوں نے سحر ہونے نہ دی
ہم نئے سورج لیے پھرتے رہے
کیسے کیسے چاند نکلے چھپ گئے
کیسے کیسے حادثے ہوتے رہے
یہ سفر بھی ایک دن کٹ جائے گا
ہم اگر ارشدؔ یوں ہی چلتے رہے

غزل نمبر ۲:

دوستی دل بری کا نام نہیں
عاشقی دل لگی کا نام نہیں

بے خودی زندگی سہی لیکن
زندگی بے خودی کا نام نہیں

ہر طرف تیرگی کے پہرے ہیں
دور تک روشنی کا نام نہیں

مٹ گئیں رفتہ رفتہ سب یادیں
لوحِ دل پر کسی کا نام نہیں

اے خریدارِ جنسِ مہر و وفا
عشق سوداگری کا نام نہیں

ڈھونڈتا پھر رہا ہے کیا ارشدؔ
اب کہیں پر خوشی کا نام نہیں

☆☆☆

اسرار النبی اسرار

۱۹۲۴ء کے لگ بھگ یو۔پی (بھارت) کے شہر بسولی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد شہداد پور آئے، یہیں تعلیم مکمل کی اور کچھ عرصہ یہاں کے ہائی اسکول میں معلم بھی رہے، پھر ایم۔اے اردو کرنے کے بعد شکار پور میں لیکچرار مقرر ہو گئے، لیکن ایک ہی سال بعد ملازمت کو خیرباد کہہ کر ایف آئی اے میں انسپکٹر ہو گئے۔ یہ ملازمت کچھ عرصے تک جاری رہی پھر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز میں کسی اچھے انتظامی عہدے پر فائز ہو گئے۔ نہایت با اصول زندگی بسر کرتے ہیں، دوست احباب کا حلقہ وسیع تھا۔ شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا۔ محترم فاضل حیدری سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ سادہ بحر پر فکر شعر کہے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

چشم نم ناک، چہرہ غم آلود — زیست ہے جیسے شمع ہو بے دود
کیسے پہنچے گا کارواں یارو — دور منزل ہے راہ بھی مسدود
ہے کوئی جو خلیل کہلائے — ہر قدم پہ ہے آتشِ نمرود
جس کو دیکھو خلوص کا بھوکا — اور خود میں خلوص ہے مفقود

راہِ اُلفت میں حضرتِ اسرارؔ
ہے بہاروں کی جستجو بے سود

غزل نمبر ۲:

محرومیوں کو حدِ نظر دیکھتے رہے — اشکوں سے اپنا دامن تر دیکھتے رہے
اہلِ خرد سے اہلِ خرد کا وہ اجتناب — دیکھا نہ جا رہا تھا مگر دیکھتے رہے
ایسے بھی لوگ تھے جو تری بزمِ ناز میں — تجھ سے بچا کے تیری نظر دیکھتے رہے
ہم ہی وہ خوش نصیب ہیں جو راہِ عشق میں — نقش و نگارِ راہ گزر دیکھتے رہے

اسرارؔ زندگی میں ہر اک گام پہ ہمیں
مجبوریوں کو پیشِ نظر دیکھتے رہے

☆☆☆

اسلام الدین آزاد

۲؍فروری ۱۹۳۲ء کو دہلی شہر کے معروف محلے پہاڑ گنج میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروباری اُلجھنوں میں پھنس گئے۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت دورانِ ہجرت جو مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کا شکار ہوئے اُن میں ان کے والد، بھائی اور ہمشیرہ بھی شامل ہیں۔ موصوف خود چھپتے چھپاتے اپنی والدہ کے ہمراہ پاکستان آئے اور شہدادپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آلام و مصائب اور دکھ درد ان کے پرانے شناسا ہیں، شادی کی، خدا نے اولاد پر اولاد سے نوازا، کچھ بچے انتقال کر گئے اور کچھ زندہ ہیں، جو زندہ ہیں ان میں سے کچھ جسمانی و ذہنی طور پر معذور ہیں۔ ان حالات میں بھی خوش و خرم رہتے ہیں، تقدیر کا شکوہ نہیں کرتے، صبر و شکر کا دامن تھامے گھریلو ذمہ داریاں خوب نبھا رہے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے خیاط ہیں چوں کہ ان کے فن میں جدیدیت کا عنصر نہیں ہے اس لیے کام بھی کم ہی ملتا ہے۔ شاید ان ہی حالات نے طبیعت کو شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا، بہت اچھا کہتے ہیں، ابتداء میں بغیر اصلاح لیے مشاعرے پڑھا کرتے تھے، اُس وقت بھی اچھی خاصی داد وصول کیا کرتے تھے۔ پھر اک روز مشاعرے کے اختتام پر مولانا اسماعیل صادق مرحوم نے ان کے کلام کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ "میاں! اصلاح لینے میں کوئی حرج نہیں، اچھا کہتے ہو، بہت اچھا کہنے کے لیے کسی کو دکھا دیا کرو"۔ اس کے بعد مولانا صاحب مرحوم سے مشورۂ سخن فرمانے لگے۔ اقبالؔ سے بے حد متاثر ہیں۔ فیضؔ، غالبؔ، جگرؔ، مصطفیٰ زیدی، احمد فراز اور پروین شاکر کو بھی پسند کرتے ہیں۔ غزلیات، سلام، قطعات اور منقبت میں طبع آزمائی کی لیکن ملکی و ملی حالات پر کہی ہوئی نظمیں ان کی شناخت بن گئیں۔ ان کی ایک نظم "میرے وطن کے پاسباں" سے متاثر ہو کر جنرل کے ایم عارف (اس وقت کے وائس چیف آف آرمی اسٹاف) نے ۵۰۰ روپے کا چیک بطور انعام بھجوایا، اس کے علاوہ سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں مرحوم، ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین اور جمیل الدین عالیؔ کی طرف سے ان کی نظم "روپ نگر کی شہزادی" کی پسندیدگی پر تہنیتی خطوط بھی مل چکے ہیں۔ ان کا کلام ہفت روزہ "بلال" راولپنڈی، ہفت روزہ "رابطہ" کراچی اور دیگر مقامی جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔

نوٹ: چند برس قبل وفات پا چکے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

ہو گئے محو حسنِ یار میں ہم
پھنس گئے زلفِ تابدار میں ہم
چین اس دل کو جب کہیں نہ ملا
لوٹ آئے ترے دیار میں ہم
جگمگاتے ہیں چاند تاروں میں
مسکراتے ہیں لالہ زار میں ہم
عجب مجبور ہیں کہ ہیں آزاد
پھنس گئے جبر و اختیار میں ہم

غزل نمبر۲:

یہ اہلِ فکر، یہ اہلِ نظر، یہ اہلِ سخن
جگر کے داغ دکھاتے رہیں گے صورت فن
نہ اپنے پاس ہے دولت نہ اپنے پاس ہے دھن
ہے ایک دل جسے کہتے ہیں درد کا مخزن
گلوں کی ہم کو طلب تھی گئے تھے سوئے چمن
یہ اور بات کہ کانٹوں سے بھر گیا دامن
تری گلی سے گزر جب کبھی ہوا میرا
رُکے رُکے ہیں قدم تیز ہو گئی دھڑکن
سکونِ قلب میسر نہیں تو کچھ بھی نہیں
اگرچہ پاس ہوں آزاد لاکھ لعلِ یمن

☆☆☆

اصغؔر وارثی ارمانی

نام سیّد اصغر علی، تخلص اصغؔر، اپنے مرشد سید وارث علی شاہ (والی دیوا شریف، ضلع بارہ بنکی، متصل شہر لکھنؤ) کی نسبت سے وارثی اور اپنے شعر و سخن کے استاد سید عبدالرحیم شاہ ارماںؔ کی نسبت سے ارمانی لکھتے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں اجمیر شریف (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور ریلوے ورکشاپ اجمیر شریف میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد عازم پاکستان ہوئے۔ ۱۹۵۷ء تک کراچی میں رہے، اس کے بعد ٹنڈو آدم میں سکونت اختیار کر لی۔

ذوقِ شعر گوئی اپنے استاد ارماںؔ سے متاثر ہو کر پیدا ہوا، تاہم بیدار لکھنوی، سکندر لکھنوی، ماہر القادری اور شکیل بدایونی سے اپنی خصوصی رفاقت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ نیز ان کے بقول انھیں علامہ اقبال، جگر مرادآبادی اور علامہ سیماب اکبرآبادی کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ جگر صاحب سے تو اچھے مراسم بھی رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کے دیوان "شعلۂ طور" کی اشاعت کی ذمہ داری بھی جگر صاحب نے قبول کی تھی مگر تقسیم ہند کے ہنگاموں کی نظر ہو گیا۔ البتہ اس سے قبل آگرہ سے ان کے دو مجموعے "آفتاب مدینہ نجات کا سفینہ" اور "گلدستۂ کلامِ اصغر" شائع ہوئے تھے جو وہیں رہ گئے اور موصوف کے پاس ان کی کوئی کاپی بھی موجود نہیں ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل آسودہ حال تھے لیکن بعد کی زندگی تاہنوز تنگدستی اور کسمپرسی میں گذر رہی ہے۔[۱] شادی بھی کی، صاحب اولاد ہیں، آج کل انتہائی ضعیف ہونے کے سبب چل پھر نہیں سکتے، گھر پر ہی رہتے ہیں، اس کے باوجود اچھا خاصا بول لیتے ہیں۔ ان سے متعلق مندرجہ بالا تمام معلومات ان ہی کی زبانی حاصل ہوئی ہیں۔

۱۔ ۱۹۹۶ء کے بعد بیماری کی حالت میں کراچی منتقل ہو گئے تھے، بعد کی کوئی خبر نہیں۔

نمونۂ کلام

نعتؐ:

دیکھے تو کوئی رفعتِ بالائے محمدؐ
ہے عرشِ بریں زیرِ کفِ پائے محمدؐ
ممکن ہے میسر ہوں مجھے طور کے جلوے
آنکھوں سے ملوں خاکِ کفِ پائے محمدؐ
ہے دل کی چمک الفتِ رندانِ گہربار
آنکھوں کی ضیاء خاکِ کفِ پائے محمدؐ
مطلوب ہے حورانِ جناں کو بنے سرمہ
اے رحمۂ خاکِ درِ والائے محمدؐ
اصغر کے لیے گرد ہیں جنت کی فضائیں
کیا سونگھ لیے گیسوئے زیبائے محمدؐ

غزل:

خیالِ زلف نے کی دل میں آ کر روشنی اپنی
اندھیری رات کی محتاج نکلی چاندنی اپنی
اگر پہلو نشیں وہ ہوں نشاطِ زندگی اپنی
یہ مہر اپنا، قمر اپنا، سہانی چاندنی اپنی
کسی ناشاد کا رو رو کے کہنا یوں شبِ فرقت
اندھیرے گھر میں آ کر تو نے کر دی چاندنی اپنی
یہ کس کے عشق میں کھویا ہوا رہتا ہے تو اصغر
نہ جانے کس لیے بے لطف کر لی زندگی اپنی

☆☆☆

اطہر جعفری

اصل نام سید غلام حیدر جعفری، اطہر تخلص، جہانِ سخن میں سید اطہر جعفری کے نام سے زندہ ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ہنڈون ریاست جے پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن ہنڈون میں حاصل کی، یہیں سے شعر فہمی کا ذوق پیدا ہوا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ ہجرت کر کے حیدرآباد سندھ اور ۱۹۶۷ء میں مستقل طور پر شہداد پور آ گئے۔ درمیان میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء تک فیصل آباد پنجاب میں حصولِ تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں قیام رہا۔ واپڈا میں ملازم ہیں۔ شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۷۰ء میں ہوا تب سے آج تک سرگرمی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ سندھ کے مختلف شہروں میں مشاعرے پڑھے، کئی بار ریڈیو پاکستان کے مشاعروں میں بھی کلام سنا چکے ہیں۔ زعفران زار طبیعت پائی ہے، شاعری میں بھی طنز و مزاح کو ذریعہ اظہار بنایا، اس کے علاوہ ان کے کلام میں اردو اور سندھی زبانوں کا امتزاج پایا جاتا ہے، گویا سندھی اردو دوستی کے قائل ہیں اور ان کے درمیان پائی جانے والی نفرتوں کو ختم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس لیے اپنے اشعار کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک ہو جانے کی ترغیب و تلقین کرتے اور دوستی و بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔

ان کا ایک مجموعہ کلام (کتاب چہ سائز میں) بعنوان "ملاحظہ فرمایئے" المشرق آرٹ اکیڈمی شہداد پور کے زیرِ اہتمام شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

نوٹ: چند برس قبل موصوف کا انتقال ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام

نظم کے چند اشعار:

میں کھوٹا تھا بالکل کھرا ہوگیا ہوں
مجھے ووٹ دینا کھڑا ہوگیا ہوں
میں بے پر کی اکثر اُڑایا کروں گا
اور آپس میں تم کو لڑایا کروں گا
پکڑواؤں گا پھر چھڑایا کروں گا
میں ہر ایک کے کام آیا کروں گا
کہ اب ہر مَرض کی دوا ہوگیا ہوں
مجھے ووٹ دینا میں کھڑا ہوگیا ہوں
اگر ہوگیا کامیاب اللہ اللہ
کروں گا میں تم سے خطاب اللہ اللہ
کھلاؤں گا شامی کباب اللہ اللہ
بناؤں گا سب کو نواب اللہ اللہ
خدا کی قسم آپ کا ہوگیا ہوں
مجھے ووٹ دینا کھڑا ہوگیا ہوں

غزل:

مطلع ہے میرا، مطلع انوار دیکھنا چشمہ لگا کے غور سے سرکار دیکھنا
بیٹھا ہے فرش پر، ہے دماغ آسمان پہ شاعر کی دور دور تلک مار دیکھنا
اپنا تو آج کل ہے یہی مشغلہ جناب راتوں کو ٹی وی، صبح کو اخبار دیکھنا
علمِ عروض سے تو میں واقف نہیں حضور لیکن ہیں وزن میں مرے اشعار دیکھنا

اطہر جو واہ واہ کے چکر میں آ گیا
مشکل ہے اس کے واسطے گھر بار دیکھنا

☆☆☆

اقبال بسمل

اصل نام جوزف اقبال جوہانس جب کہ شعر و سخن کے حوالے سے اقبال بسمل کہلاتے ہیں، بسمل بطور تخلص فرماتے ہیں۔ ۹؍جون ۱۹۳۸ء کو اوکاڑہ میں پیدا ہوئے، والد سرافین یوحنا معلم تھے، انھیں بھی شاعری کا خاصا شغف تھا، اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے، ملازمت کے سلسلے میں انھیں مختلف مقامات پر ہجرت کرنا پڑی چنانچہ بسمل کے تعلیمی مدارج بھی مختلف شہروں میں طے پائے۔ پرائمری تا میٹرک کے امتحانات جالندھر، اوکاڑہ، کوئٹہ اور خوش پور چک نمبر ۵۱، گ۔ ب فیصل آباد سے پاس کیے جب کہ جے وی کا امتحان کمالیہ سے دیا، اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں بحیثیت پرائمری استاد اے۔ وی مڈل اسکول گوجرہ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ڈون باسکو ہائی اسکول لاہور تبادلہ ہوا اسی سال پنجاب بورڈ سے انٹر کیا۔ ۹؍جون ۱۹۶۲ء میں

خاتون فاطمہ ہائی اسکول سانگھڑ میں تبادلہ ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں سندھ یونیورسٹی سے بی اے، ۱۹۶۷ء میں بی ایڈ اور ۱۹۶۹ء میں ایم اے (اردو) کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۸۲ء میں سندھ لاء کالج حیدرآباد سے ایل ایل بی کیا، اسی سال گورنمنٹ ہائی اسکول نوآباد میں بحیثیت صدر مدرس تقرر ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر بنا کر ٹھٹھہ تبادلہ کردیا گیا۔ ایک ہی سال بعد گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ شاہی میں صدر مدرس بنادیے گئے جہاں ۳؍اپریل ۱۹۸۹ء تک مقرر رہے، پھر گورنمنٹ ہائی اسکول چک نمبر ۳ سانگھڑ میں تبادلہ کروالیا تاحال وہیں ہیں[1]۔

معاشی طور پر متوسط زندگی بسر کررہے ہیں۔ اولاد میں ۳ بیٹے اور ۴ بیٹیاں ہیں جو سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں، ایک بیٹے نے ایم بی اے کیا ہے جب کہ ایک بیٹی آمنہ فرحت جو معلمہ ہیں نے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شعر و سخن سے رشتہ استوار کیا ہے۔

تبسمؔ اسکول کے زمانے سے شعر کہتے آرہے ہیں۔ غالبؔ، فیضؔ اور حالیؔ سے بے حد متاثر ہیں، ابتداء میں اپنے والد سے مشورۂ سخن کرتے تھے لیکن ان کے بعد باقاعدہ کسی سے سلسلۂ تلمذ نہ جوڑا۔ اب تک ڈھائی تین سو کے لگ بھگ غزلیں، نظمیں کہہ چکے ہیں، شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری، ڈرامہ نویسی، انشائیہ اور تحقیقی مقالہ نگاری ان کی محبوب اصناف ہیں جن میں بیک وقت طبع آزمائی کرتے ہیں۔ وہ ڈراموں "عبرت" اور "مقدس فرانسس" پر بالترتیب کاتھولک تنظیم المصنفین کراچی اور سینٹ فرانس کانگریگیشن کی جانب سے پہلا انعام بھی مل چکا ہے ان کے علاوہ ویل وشرز ایسوسی ایشن آف پاک نیویارک امریکہ، سیرا کلب آف پاک کراچی، پاکستان منارٹی فرنٹ کراچی اور العالم سوشل ویلفیئر ٹرسٹ کراچی پاکستان سمیت کئی دیگر اداروں اور تنظیموں کی جانب سے تعریفی اسناد اور شیلڈز بطور انعام وصول کرچکے ہیں۔

اب تک ان کی پانچ[2] تصانیف "۵ نامور مسیحی ادیب"، "پاکستان ہمارا بھی ہے"، "اردو ادب میں مسیحی ادیبوں کا کردار"، "ضربِ طلاق" اور ایک شعری مجموعہ "فلک کے نغمے زمیں کی آہیں" منظرِ عام پر آچکی ہیں، ان کے قلمی مقاصد مسیحی قوم کی بیداری اور اُن کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے، بقول ان کے سرسید، اقبالؔ اور حالیؔ نے جو کام مسلمان قوم کے لیے انجام دیا ہے وہی کام موصوف اپنی قوم کے لیے انجام دینا چاہتے ہیں۔ اُن کے اشعار اور نثر میں روایتی حسن و عشق کے بجائے قومی یک جہتی اور بیداری کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

---

[1] ملازمت سے سبکدوش ہوچکے۔

[2] ۱۹۹۶ء کے بعد کئی اور تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر۱:

برق نے خرمنِ ایماں جلا دیا
جوشِ جنوں نے راستہ حق کا بھلا دیا

عیش و نشاط رنج و الم میں بدل گئے
زر کی ہوس نے میرا مقدر سلا دیا

وارفتگی میں ہم جو سمجھے بھنور کنارا
ساقی نے کیا خبر ہمیں کیا کچھ پلا دیا

بھٹکے ہوئے ہیں پھر بھی اسی پہ ہے اعتماد
"قم" کہہ کے جس مسیحا نے مردہ جلا دیا

لوٹے خزاں نے شجرِ محبت کے برگ و بار
غنچۂ دل کو خاک میں بسمل ملا دیا

غزل نمبر۲:

نعروں سے ترے شاقی، دنیا کو ہلا دیں گے
خوابیدہ مسیحوں کو اک بار جگا دیں گے

چھائے ہیں جو مذہب پر ظلمت کی فضا بن کر
وہ نقشِ کہن سارے اک بار مٹا دیں گے

پنہاں ہیں مسیحیت میں اوصافِ حمیدہ جو
طوفانِ حسن ان کا دنیا کو دکھا دیں گے

ناداں ہو جو کہتے ہو بدلیں گی نہ تقدیریں
مسجودِ ملائک پھر آدم کو بنا دیں گے

سینے میں یہ ہے پنہاں اک جوشِ قلب میرے
بدکار کو بھی بسمل ہم نیک بنا دیں گے

☆☆☆

اکبر معصومؔ

نام اکبر علی، تخلص معصومؔ۔ ۸؍اگست ۱۹۶۱ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی، نامساعد حالات کے سبب تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، بچپن میں بھی ٹائیفائیڈ ہوا تھا جو بگڑ گیا تھا، کچھ عرصہ اُس کی لپیٹ میں رہنے کے بعد درمیان میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے تھے اور معاملاتِ زندگی میں سرگرمیاں بھی دکھانے لگے تھے، مگر چند سال پہلے سے دوبارہ بیمار ہیں، کچھ عرصہ تو ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے سے بھی معذور ہو گئے تھے، اب بھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں تاہم لکھ پڑھ لیتے ہیں اور کچھ دیر بیٹھ کر دوست احباب سے بات چیت بھی کر لیتے ہیں، ا مطالعہ وسیع ہے۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ فنِ مصوری کا بھی شغف رکھتے ہیں اور اس فن کو کمرشل بنیادوں پر انجام دیتے ہیں۔

۱۹۷۹ء سے شعر کہہ رہے ہیں، ابتداء میں فہیمؔ زیدی صاحب سے مشورہ سخن لیتے رہے، لیکن بہت کم عرصہ تک، معروف شعراء میں میرؔ کے حد درجہ مداح ہیں، اس کے علاوہ ظفرؔ اقبال، منیرؔ نیازی اور جون ایلیاؔ کو بھی پسند کرتے ہیں۔ "تخلیق کار" نامی ایک ادبی تنظیم کے بانیوں میں سے ہیں، جس کے تحت سانگھڑ میں کئی ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کروا چکے ہیں، آج کل مشاعروں میں شرکت سے پرہیز کرتے ہیں۔ اب تک سیکڑوں غزلیں کہہ چکے ہیں، ان کا ایک شعری مجموعہ "میں اور میں" زیرِ طبع ہے۲۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

یہ نہیں ہے ملال کم تھا مجھے
لیکن اس کا خیال کم تھا مجھے
اپنی وحشت سے میں زیادہ تھا
اور وہ خوش جمال کم تھا مجھے

---

۱ ہومیوپیتھک کا کورس کرنے کے بعد آج کل سانگھڑ میں اپنے ذاتی مطب پر کل وقتی پریکٹس کرتے ہیں۔

۲ ۲۰۰۰ء میں یہ مجموعہ "اور کہاں تک جانا ہے" کے عنوان سے فضلی سنز کراچی کے تحت شائع ہوا، اس کے علاوہ آغا سلیم کے ناول "ہمہ اوست" کا اردو ترجمہ کیا جو ۲۰۰۲ء میں فضلی سنز کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔

میں جو ماضی میں جا ہوا آباد
بات یہ تھی کہ حال کم تھا مجھے
خوب برسا ہوں ابر سا خود بھی
موسم برشگال کم تھا مجھے
مر رہا تھا میں ہجر میں اُس کے
پھر بھی شوقِ وصال کم تھا مجھے

غزل نمبر۲:

اب تجھے بھی بھلانے والا ہوں
میں بہت دکھ اُٹھانے والا ہوں
ایک موسم ہوں پر نہیں معلوم
آ چکا ہوں کہ آنے والا ہوں
تیرے دریا کے بھید کیا جانوں
میں تو کشتی بنانے والا ہوں
سن سکو گے اے ثابت و سیّار
میں جو قصہ سنانے والا ہوں
میں عدم سے وجود میں آیا
اب کہیں اور جانے والا ہوں

☆☆☆

امتیاز علی امتیاز

۲۱ جنوری ۱۹۴۳ء کو یو پی (بھارت) کے ضلع جالون کے صدر مقام اورئی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان آئے اور ٹنڈو آدم میں متمکن ہوئے۔ بی۔کام تک تعلیم حاصل کی، اسلام آباد سے ایف۔آئی۔ایم کا کورس پاس کرنے کے بعد میونسپل فیملی ہاسپٹل ٹنڈو آدم میں کمپاؤنڈر ہو گئے۔ آج کل بحیثیت سینئر اسسٹنٹ کام کر رہے ہیں۔ ۲۷ رجون ۱۹۷۰ء میں شادی کی جس سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ معاشی طور پر حالات شروع دن ہی سے سازگار نہیں ہیں۔ پاکستان آنے کے فوراً بعد سے گھر کی تمام تر ذمہ داریاں ان ہی پر عائد ہو گئیں، بڑے بھائی حافظؔ علی حافظ جو خود شاعر ہیں بھارت ہی میں ٹھہر گئے۔

شاعری کا شوق اپنے والد اور بڑے بھائی کو مشاعروں میں سُن کر ہوا اور ۱۳ رسال کی عمر میں پہلی نعت کہی، ابتداء میں والد سے اصلاح لیتے رہے، قیام پاکستان کے بعد دردؔ سعیدی مرحوم سے ربط تلمذ قائم کر لیا۔ غالبؔ، مومنؔ، میرؔ، فیضؔ، ناصرؔ، فرازؔ اور شکیبؔ جلالی ان کے پسندیدہ شعراء ہیں۔ اب تک رباعی، قطعہ، نعت اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے، کچھ عرصہ ٹنڈو آدم کی ادبی تنظیم ''فکر و نظر'' سے بھی منسلک رہے، آج کل مقامی مشاعروں میں پڑھتے ہیں، ترنم خوب ہے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر۱:

کون کہتا ہے میں امیر نہیں — دولتِ درد ہے فقیر نہیں
مجھ سے خود ہے چمن کی زیبائی — میں گلوں کا کوئی سفیر نہیں
اس کی دہلیز میرا کعبہ ہے — کیسے ہٹ جاؤں راہ گیر نہیں
سنگِ مرمر کے ایک بت کی طرح — کوئی معصوم ہے شریر نہیں
تیری زلفوں میں کب سے اُلجھا ہوں — میں بہ ظاہر کوئی اسیر نہیں
ہم نے اس کو فلک پہ پہنچایا — کوئی اتنا وہ بے نظیر نہیں

میں تو خورشیدِ فن ہوں اے امیرؔ
کہکشاں کی کوئی لکیر نہیں

غزل نمبر۲:

جدائی کی لمبی سزا دے گیا ہے — گیا وقت ہم کو یہ کیا دے گیا ہے
سرِ راہ رُک کر جو آج اُس نے دیکھا — وہ زخموں کو پھر سے ہوا دے گیا ہے
محبت نہیں تھی عقیدت تھی جس سے — وہی شخص ہم کو دعا دے گیا ہے
ہماری طرح تم بھٹکتے پھرو گے — وہ جاتے ہوئے یہ صدا دے گیا ہے
یہ کس نے مجھے زندگی پھر سے بخشی — مسیحا وہ کیسی دوا دے گیا ہے

امیرؔ ایک پل بھی نہیں چین دل کو
یہ کیسی مجھے وہ سزا دے گیا ہے

☆☆☆

انجم امین ناصرہ چودھری

امین ناصرہ چودھری المتخلص بہ انجم۔ ۴؍ مارچ ۱۹۶۲ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئیں۔ ۸۳۔۱۹۸۲ء میں ایم اے سیاسیات، ۸۷۔۱۹۸۶ء میں ایم اے انگلش اور ۹۱۔۱۹۹۰ء میں ایم اے مطالعہ پاکستان کیا۔

سانگھڑ شہر میں "سندھ ماڈل اسکول" اور "اسٹروِنگ بیس ایجوکیشنل اکیڈمی" کے نام سے دو تعلیمی ادارے قائم کیے۔ مختلف سماجی، ادبی اور سیاسی تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔ ماضی میں انجمن فروغِ ادب سانگھڑ اور دھرتی لوک سنگت سانگھڑ سے بھی وابستگی رہی ہے۔

شعر گوئی کا شوق زمانہ طالب علمی سے ہوا، نویں جماعت میں تھیں جب پہلی نظم "اخبارِ جہاں" کے بچوں کے صفحات پر شائع ہوئی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

اک موجِ درد بیچ بھنور آ بسا گئے
پھیلا ہوا سراب مجھے چار سو لگے
پانی پہ اپنا عکس مجھے تیرتا ملا
تھی خامشی، سکوت، مگر گفتگو لگے
آیا ہی تھا خیال کہ آنسو بھی آ گئے
اشکوں کی یہ روانی کوئی آرزو لگے
تھے قرضِ جاں پہ جتنے لوٹائے کچھ اس طرح
خود اپنی ذاتِ حق سے ادا سرخرو لگے
انجم نہ جاؤ آج شبِ غم سیاہ ہے
ایسا نہ ہو کہ داغ تنِ آبرو لگے

غزل نمبر ۲:

دنیا میں کتنی بے بسی دیکھی
ہر طرف تلخ زندگی دیکھی
بے تکلف تھی اپنی چاہت اور
اُس کے چہرے پہ برہمی دیکھی
لاشے سڑکوں پہ روندتے گزرے
اہلِ ثروت کی بے حسی دیکھی

☆☆☆

بخشن مہرانوی

محمد بخشن مہر المعروف بخشن مہرانوی۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جھول ضلع سانگھڑ میں پیدا ہوئے۔ زراعت میں بی ایس سی آنرز اور سندھی ادب میں ایم۔ اے کیا، سندھ ایرڈ زون ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سازدا) میں ایگرو لائیو اسٹاک آفیسر کے طور پر چھپرو میں ملازم ہیں، مستقل رہائش سانگھڑ میں ہے، جہاں اُن کا اپنا "الفقرا پرنٹنگ پریس" ہے جو ان کے والد فقیر محمد رحیم مہر نے لگایا تھا۔ مرحوم نے اسی پریس سے سہ روزہ سندھی اخبار "الفقرا" بھی جاری کیا جسے بعد میں بخشن مہرانوی کچھ عرصے تک نکالتے رہے۔ اسی اخبار میں کام کرنے کے دوران شعر فہمی کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۸۳ء سے باقاعدہ مشقِ سخن جاری کی، ادبی اور علمی شخصیات سے میل جول پیدا کیا اور پھر رفتہ رفتہ اچھا کہنے والوں میں شمار کیے جانے لگے۔ بنیادی طور پر سندھی کے شاعر ہیں لیکن کچھ عرصے سے اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُردو رسائل و جرائد میں ان کا کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں چند ایک اُردو مشاعرے بھی پڑھے ہیں، جن میں ایک مشاعرہ جو دیالداس کلب حیدرآباد میں زیرِ صدارت جناب تابش دہلوی کے ہوا تھا بھی شامل ہے۔ ان کے پسندیدہ شعراء شاہ عبداللطیف بھٹائی، شیخ ایاز، مظہر لغاری، منیر نیازی، جونؔ ایلیا، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر ہیں۔ اُردو شاعری میں ان کی پسندیدہ صنف "نثری نظم" ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ بہترین کمپیئر بھی ہیں، آٹھ سال تک ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے بھی منسلک رہے ہیں، صوبائی سطح پر کئی علمی، ادبی اور ثقافتی پروگرام آرگنائز کیے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک عرصے تک سندھی ادبی سنگت، کے سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ سیر و تفریح کے شوقین ہیں۔

نمونہ کلام

نظمیں:

المیہ

مجھے جب غصہ آتا ہے
میں اپنے کھوئے ہوئے سفر کو لوٹانے
راستوں کے پاس جاتا ہوں
راستے!
اُلٹا مجھے گرد راہ بنا دیتے ہیں
میں اپنی بے کار پڑی ہوئی زندگی سے
ایک صلیب بنانا چاہتا ہوں
اور اس پہ سونے کی کوشش کرتا ہوں
لیکن مجھے نیند نہیں آتی
میری ماں مجھے
مریم کی طرح دودھ پلاتی ہے
لیکن میرا المیہ یہ ہے کہ
میں عیسیٰ نہیں بن سکتا

پاؤں ہی کافی نہیں ہوتے

بہار کا جھونکا
ہمیں اُلٹے پاؤں کیوں چلاتا ہے؟
زندگی کو آگے دیکھنے کی کوشش میں
ہم سورج کی طرح ڈوب کیوں جاتے ہیں؟
پلیٹ فارم پر کھڑی ریل گاڑی
سگنل کی محتاج کیوں ہے؟
دروازے اندر آنے کے سوا
باہر بھی تو لے جاتے ہیں
مگر کوئی کیا کر سکتا ہے
چلنے کے لیے
پاؤں ہی کافی نہیں ہوتے

☆☆☆

بزم آرا بزمی

استاد شاعر بیدار رام پوری کی بیٹی اور نگہت زیبا کی چھوٹی بہن بزم آرا، تخلص بہ بزمی، ۷ر ستمبر ۱۹۷۱ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئیں۔ ایم۔اے، بی ایڈ کیا، آج کل گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول شہداد پور میں معلمہ ہیں، گھر کے ادبی ماحول اور موزوں طبیعت کے سبب کم سنی ہی میں شعر کہنے لگی ہیں۔ پروفیسر فدا انصاری اور نگہت زیبا سے اصلاح لیتی ہیں۔ اقبال، محشر بدایونی اور جوش ملیح آبادی سے متاثر ہیں، کم سنی میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئیں، ناسازگار حالات نے احساس کو شدید تر کر دیا، گردشِ حالات نے جدوجہد پر اکسایا، تعلیم پر توجہ زیادہ رہی اس عرصے میں لکھنے لکھانے اور شعر کہنے کا خاطر خواہ موقع نہ مل سکا اس لیے کم لکھا، آج کل شعر گوئی کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ مشاعرے بھی پڑھتی ہیں، اس کے علاوہ ان کا کلام مقامی جرائد میں شایع بھی ہو رہا ہے، نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن بحیثیت شاعرہ نام پیدا کرنا چاہتی ہیں، نعت اور غزل تو ان کی محبوب صنف ہے ہی لیکن طنز و مزاح میں بھی خوب کہتی ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

کسی شاعر نے جو دیکھا کسی کے گول چہرے کو
تو فوراً چودھویں کا چاند وہ چہرہ بنا ڈالا
ریاضی دان نے دیکھا تو وہ کچھ اس طرح بولا
خدا نے ناک پہ پرکار رکھی اور گھما ڈالا

ان کے کلام اور مشقِ سخن کو دیکھتے ہوئے توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنے منفرد انداز، جدت پسندی اور شوکتِ لفظی کے سبب شاعرات میں منفرد مقام پیدا کر لیں گی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

لفظ و معانی بن کے طرحدار آگئے
ترتیب وار ذہن میں اشعار آگئے

چھوٹی سی آرزو مری پوری نہ ہو سکی
توڑا جو پھول ہاتھ میں کچھ خار آگئے

جب بھی کسی خوشی کی طرف اک نگاہ کی
حزن و ملال سامنے ہر بار آگئے

وہ دے رہے ہیں سب کو نیا عالمی نظام
بن کر جہانِ کل کے وہ مختار آگئے

بزمیؔ کا یہ نصیب ہے کہ دھوپ میں جلے
ہمدم تو زیرِ سایۂ دیوار آگئے

غزل نمبر ۲:

معصوم تمناؤں نے گھر اپنا جلا کر
دے دی ہے ہمیں دیکھیے جنت یہ سجا کر

سننے کے لیے سچ کوئی تیار نہیں ہے
دستورِ زباں بندی ہے کچھ بھی نہ کہا کر

رشوت نے اگر دے ہی دیا ہے کوئی منصب
اللہ کے بندے تو فرائض تو ادا کر

شعلوں کا جنوں رقص تھا بستی کی فضا میں
اک آدمی نکلا تھا فقط جان بچا کر

سچ بولنا عادت ہی بنالی ہے تو بزمیؔ
اب تو کسی افسر سے دبا کر نہ ڈرا کر

☆☆☆

جمیل خاورؔ

اصل نام جمیل الرحمٰن، تخلص خاورؔ، بزمِ شعر و سخن میں جمیل خاورؔ کے نام سے جانے جاتے ہیں، ۱۴ر نومبر ۱۹۳۷ء کو جاورہ (گلشن آباد) بھارت میں پیدا ہوئے[1]۔ ۱۹۵۲ء میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور ٹنڈو آدم میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اُردو میں ایم۔اے کیا، درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے، آج کل نیو علی گڑھ گورنمنٹ کالج ٹنڈو آدم میں اُردو کے استاد ہیں[2]۔

انتہائی منکسار اور مخلص انسان ہونے کے ساتھ ساتھ مشفق استاد بھی ہیں، ۱۹۶۵ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستان ریڈیو، ٹی وی سے نشر ہونے والے ملی نغمات سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی، ابتداء میں سفیرؔ گلشن آبادی سے مشورۂ سخن فرماتے تھے، طبیعت اور مزاج فطری طور پر شاعری کے لیے موزوں پایا ہے۔ غزل اور نظم دونوں ہی ان کی محبوب صنفیں ہیں، البتہ زیادہ تر غزل پر توجہ ہے، اب تک سو کے لگ بھگ غزلیں نظمیں کہہ چکے ہیں۔ شاعری میں غالبؔ، حالیؔ، اقبالؔ، ماہر القادری، فیضؔ اور عدمؔ سے متاثر ہیں۔ اس وقت ان کا شمار ٹنڈو آدم کے منجھے ہوئے شعراء میں ہوتا ہے[3]۔

---

[1] تعلیمی اسناد میں تاریخِ پیدائش مختلف درج ہے۔

[2] کچھ عرصہ قبل ملازمت کی مدت مکمل ہونے پر سبکدوش ہو چکے۔

[3] ان دنوں مستقل طور پر کراچی میں ہوتے ہیں اور ناسازیٔ طبع کی بنا پر ادبی حلقوں سے دور ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

اس طرح دریچوں کو روز و شب نہ کھولا کر
شہر سارا گھائل ہے، کچھ تو یہ بھی سوچا کر

جو تجھے بھلا بیٹھے اس کو یاد کیا کرنا
اس طرح کے لوگوں کو پھر کبھی نہ سوچا کر

دھوپ کی تمازت نے وہ سکون لوٹا ہے
پیڑ ہے تو سایہ کر، ابر ہے تو برسا کر

کس طرح سے ہم سمجھیں کس طرح سے ہم جانیں
پھول ہے تو مہکا کر، چاند ہے تو نکلا کر

رتجگوں کی عادت نے نیند لوٹ لی خاورؔ
دوست ٹھیک کہتے تھے، رات بھر نہ جاگا کر

غزل نمبر۲:

ظلم زیرِ آسماں اور ایک میں
آنسوؤں کی کہکشاں اور ایک ہیں

یہ متاعِ جاں بھی اب لٹ جائے گی
ہے ہجومِ مہوشاں اور ایک میں

بالمشافہ گفتگو کے باوجود
حسرتیں نوحہ کناں اور ایک میں

یہ کہاں تک ساتھ دیں گے سوچیے
یہ فضائے بے کراں اور ایک میں

ہوگئیں کچے گھروں پہ بارشیں
آسماں گریہ کناں اور ایک میں

ہے تحیر روشنی کا پیرہن
بجلیاں ہی بجلیاں اور ایک میں

بزمِ جاناں میں بھی خاورؔ خوب تھا
چاند، تارے، کہکشاں اور ایک میں

☆☆☆

جوہرؔ سعیدی

ٹونک میں پیدا ہوئے۔ بسمل سعیدی سے شرف تلمذ رہا، اسی نسبت سے سعیدی کہلائے، بلاشبہ ان کا شمار سعیدی قبیلے کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جو آج بسمل سعیدی کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں یا جن پر ٹونک والے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ۳۸۔۱۹۳۷ء میں کیا، اُن دنوں ٹونک ہی میں تھے، شہر ٹونک کی ادبی فضا اور ان کے والد گرامی سید سلامت علی المتخلص بہ سلامتؔ کی ذات ان کے شعر گوئی کے محرکات ثابت ہوئے۔ ذوق کی مزید تسکین کے لیے دہلی چلے گئے، کئی برس وہاں گذارے، اسی دوران لکھنؤ، کانپور، آگرہ اور دیگر کئی شہروں کے ادبی سفر کیے، ملک کے مایہ ناز اکابرین علم و ادب کو دیکھا، سنا اور اُن سے فیض پایا۔ تقسیم ملک کے چند برسوں بعد ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آگئے، جہاں زندگی کے کئی یادگار سال گذارے، بعد ازاں کراچی منتقل ہو گئے[1]۔

ٹنڈو آدم قیام کے عرصے میں انھوں نے وردؔ سعیدی اور قمرؔ ہاشمی کے ساتھ مل کر ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے جدوجہد کی۔ مشاعرے منعقد کروائے، نیز ادبی مجالس کے اہتمام میں سرگرمی سے شریک رہے۔

یوں تو حمد، نعت، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں مگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، پوری زندگی غزل کی زلفیں سلجھانے میں گذار دی۔ علاوہ ازیں ان کے دو صاحبزادے ثروتؔ سعیدی مرحوم اور اختر سعیدی جبکہ بھائی لیاقت علی تیرؔ کی زود گوئی اور پختہ کلامی بھی مسلّم ہے۔

"بادِ سبک دست" ان کی شاعری کا نقشِ اوّل ہے جو اکتوبر ۱۹۸۱ء میں بزم جوہرؔ سعیدی لانڈھی کراچی کے زیر اہتمام شایع ہوا، جس کا پیش لفظ جناب سلیم احمد اور دیباچہ جناب انجم اعظمی کا تحریر کردہ ہے۔ علاوہ ازیں فلیپ پر جمیل الدین عالیؔ، سحرؔ انصاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور محمد علی صدیقی کے تاثرات شامل ہیں۔ ان کے دیگر دو مجموعے "سفارت گل"[2] اور "رحمت العالمین"(مشتمل بہ احادیث

---

[1] ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء کو کراچی میں وفات پائی۔ [2] ۱۹۹۸ء میں شایع ہو چکا ہے۔

کے منظوم تراجم) منتظرِ اشاعت ہیں۔

المختصر جوہرؔ سعیدی ایک ایسے قادرالکلام اور زود گو شاعر ہیں جو غزل کی زبان میں زمانے کی بے راہ روی، اخلاقی و معاشرتی پستی، انحطاط اور انسانی رشتوں کی گرتی ہوئی اقدار کو بڑے ہی خوب صورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام

نعت:

گم شدہ سلسلۂ عہد و ابد مل جائے
کاش پھر اُنؐ کی غلامی کی سند مل جائے

جس کو چھوتے ہی، نظر آئیں حرا کے جلوے
جانِ مضطر کی تگ و دو کو وہ حد مل جائے

سیرتِ پاکِ محمدؐ جو رہے پیشِ نظر
روحِ تہذیب تمنائے ابد مل جائے

عام ہوجائے اگر، فکرِ رسولِ عربیؐ
قافلوں کو رہِ ہستی کے، رسد مل جائے

کشتیِ عمرِ رواں کو یہ سہولت جوہرؔ
موج و طوفاں سے گذرنے کی سند مل جائے

غزل:

شب پرستو! درِ امکانِ سحر بند کرو
مجھ سے پہلے میرے خوابوں کو نظر بند کرو

ذرہ ذرہ میں، نظر آئے سراپا اُن کا
تم اگر سلسلۂ نقد و نظر بند کرو

کج روی جہدِ مسلسل میں نہیں ہے شامل
کج روی ساتھ نہ چھوڑے تو سفر بند کرو

ربط اتنا بھی اُجالوں سے رہے کیوں باقی
ہے جو یہ سامنے، اک روزنِ در بند کرو

بے ہنر جنسِ گراں، اہلِ ہنر سرگرداں
یہ تماشا سرِ بازارِ ہنر بند کرو

دو اجازت اُسے پھر خاک میں مل جانے کی
اپنا دیدار بھی جوہرؔ پہ اگر بند کرو

☆☆☆

حامد علی جامیؔ

سلیم احسن کے چھوٹے بھائی ہیں، مراد آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد شہداد پور میں سکونت اختیار کی، مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے، سیاسی جلسوں میں سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد سے موصوف کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ جب تک یہاں رہے شعر و سخن کی محفلوں کو سجاتے رہے۔ مولانا محمد اسماعیل صادق مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

غم میں آنسو خوشی میں آنسو ہیں　　ہر طرف زندگی میں آنسو ہیں
سرد کتنی ہیں چاند کی کرنیں　　کس کے یہ چاندنی میں آنسو ہیں
مسکرانے کا دور بیت گیا　　اب تو بس زندگی میں آنسو ہیں
اشک بن بن کے بہہ گئے ہیں ہم　　آپ کی آنکھ ہی میں آنسو ہیں

کیوں نہ آنسو عزیز ہوں جامیؔ
ساتھ ہی بے کسی میں آنسو ہیں

غزل نمبر ۲:

وہ پیکرِ بہار جدھر سے گذر گیا　　رنگ آ گیا گلوں پہ گلستاں نکھر گیا
ہم اب بھی جی رہے ہیں یہ حیرت کی بات ہے　　تم سے ملے ہوئے تو زمانہ گذر گیا
وحشت نے میری چین نہ لینے دیا مجھے　　تیرے حسیں دیار سے بھی میں گذر گیا
تیرے ستم کو کیسے کہوں گا میں ناروا　　جو میری زندگی میں نئے رنگ بھر گیا

اپنی غزل پہ ان سے ملی ہے مجھے یہ داد
جامیؔ تو خوب قافیہ پیمائی کر گیا

☆☆☆

خالد حسین اشکائی

خالد حسین المتخلص بہ اشکائی ۱۹۵۷ء میں شہداد پور میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کی، اُس کے بعد کاروبار کے حوالے ہوگئے، ساتھ ساتھ صحافت سے بھی منسلک ہیں اور آج کل روزنامہ "نوائے وقت" کے لیے شہداد پور میں بطور نمائندہ کام کر رہے ہیں۔ شعر گوئی کا ذوق ۱۹۷۵ء میں اساتذہ کی ترغیب و تحریک پر ہوا۔ بیدار رام پوری کی شفقت اور اصلاح سے فن میں نکھار پیدا ہوا، موجودہ شعراء میں خالد عرفان سے متاثر ہیں، ایک عرصے تک سرگرمی سے شعر کہتے رہے ہیں لیکن آج کل کاروباری مصروفیتوں اور صحافت کی سرگرمیوں نے انھیں شعر گوئی سے دور کر دیا ہے، مشاعروں وغیرہ میں نہیں پڑھتے اور نہ ہی ادبی نشستوں میں حصہ لیتے ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

وعدے وفا کے جانِ بہاراں کہاں گئے　　جینے کے اب ہمارے وہ ارماں کہاں گئے

ہم تا ہنوز منزلِ عرفاں نہ پا سکے　　اب قافلے کے اپنے حدی کہاں گئے

سینچا تھا اپنے خون سے جس نے وطن کا باغ　　وہ پاک باز راہ نمایاں کہاں گئے

جاری ہیں اشک جن کی جدائی میں رات دن
اشکائی وہ بہارِ گلستاں کہاں گئے

غزل نمبر ۲:

ہر سمت مری آہوں سے اک غم کا جہاں ہے　　ہر دل میں مرے درد کا افسانہ بھی ہوگا

اب کون سرِ بزم کرے شورِ اناالحق　　گو عشق میں یہ کام عظیمانہ بھی ہوگا

معلوم نہ تھا دشتِ محبت کے سفر میں　　خود تجھ سے ہی یہ دل مرا بیگانہ بھی ہوگا

اشکائی وہ معدوم وفا آئیں گے جب تک
لبریز مری عمر کا پیمانہ بھی ہوگا

☆☆☆

خالد حسین آزاد

خالد حسین المتخلص بہ آزاد ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ آج کل سانگھڑ کے ایک پرائمری اسکول میں بحیثیت معلم ملازم ہیں۔ گھر کی تمام تر ذمہ داریوں کے واحد کفیل ہیں۔ انتہائی متوسط زندگی گذار رہے ہیں۔ خط انتہائی نفیس ہے۔ خوش نویسی اور آرٹ کے فن سے خوب واقف ہیں۔ ان کے کئی شاگرد اس وقت سانگھڑ کے بہترین پینٹر اور آرٹسٹ ہیں۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ گفتگو میں انکساری اور عاجزی پائی جاتی ہے۔ لہجہ شیریں اور شائستہ ہے۔

شعر گوئی کا ذوق کالج کے زمانے میں اردو کے پروفیسر فضل حق صاحب کی ترغیب و تحریص پر ہوا۔ زانوئے تلمذ ڈاکٹر قیصر افغانی مرحوم کی نگرانی میں طے کیے۔ میر تقی اور منیر نیازی سمیت جن شعراء کو بھی پڑھا وہی پسند و معیار بن گئے۔

غزل کے منجھے ہوئے شاعر ہیں، بیک وقت اردو، سندھی، سرائیکی اور پنجابی میں شعر کہتے ہیں۔ اس وقت ضلع سانگھڑ کے بڑے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں[1]۔

---

[1] علالت کے باعث ۲۰۱۳ء میں وفات پا چکے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

ٹوٹا ہوں جن ہاتھوں کی نادانی سے
دیکھ رہا ہوں اُن کو میں حیرانی سے

صحراؤں کی گود میں پلنے والوں کو
خوف آتا ہے اب دل کی ویرانی سے

نئی تو ہے پر ہے نہ بات اچنبھے کی
قسمت کے لکھے کو دھونا پانی سے

کیا آواز ہے خوشبو میں جو آ آ کر
سانپ لپٹ جاتے ہیں رات کی رانی سے

اپنے آپ کو اُس کی صورت ڈھالوں گا
چن کر اک کردار میں کسی کہانی سے

غزل نمبر ۲:

مری وسعت کو تا افلاک کر دے
وگرنہ مجھ کو رزقِ خاک کر دے

مرے دامن میں بھر جائیں ستارے
مجھے یہ آسماں پوشاک کر دے

ستاروں کی تمنا کر رہی ہیں
مری آنکھوں کو پھر نم ناک کر دے

میں کب تک دوسروں کی سمت دیکھوں
عطا مجھ کو مرا ادراک کر دے

مجھے آزاد رہنے دے جہاں میں
نہ اسیرِ عشقِ بے باک کر دے

☆☆☆

رحیم صدیقی عیاںؔ

رحیم صدیقی المتخلص بہ عیاںؔ ڈبائی، یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں شہداد پور ہجرت کی، تقریباً چودہ بیس برس یہاں قیام رہا، اس کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ شہداد پور میں فٹبال کے بہترین کھلاڑی کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے۔ بازار میں باٹا کا بوٹ ہاؤس چلاتے تھے اس وقت سرکاری ملازم نہیں تھے۔ زندگی اگرچہ تنگ دستی میں نہیں گزری تاہم قدرت کی طرف سے ماں، باپ اور جواں بہن بھائیوں کی پے در پے اموات نے اُن کا رشتہ غموں سے جوڑ دیا جنھیں انھوں نے مثالی صبر و تحمل سے برداشت کیا، شاید یہی دکھ ان کے شاعر ہونے میں کارگر ثابت ہوئے۔ ان کی شاعری میں رنج والم اور مصائب کی جھلک نمایاں ہے اس کے علاوہ ہجر و فراق کی کیفیات کو بھی حسین و لطیف انداز میں نظم کیا ہے۔ غزل کے علاوہ نظم، حمد اور نعت سمیت چند ایک دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھیں بھی مولانا محمد اسماعیل صادقؔ مرحوم کے شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہے۔ اُن سے اصلاح لی ہے تاہم ان کا انداز سخن اپنے استاد سے بالکل جدا ہے۔

۱۹۷۰ء میں "دائرۂ ادب کراچی" کے زیر اہتمام ان کا پہلا مجموعۂ کلام بعنوان "دائرہ" شائع ہوا۔

نمونہ کلام

نعت:

درد دل کی دوا بن گئی — خاک، خاکِ شفا بن گئی
عکسِ نورِ خدا بن گئی — شکل خود آئینہ بن گئی
ماہ و انجم تصدق ہوئے — کہکشاں نقشِ پا بن گئی
جیسے تفسیر قرآن کی — آپؐ کی ہر ادا بن گئی

حمد لکھنی تھی میں نے مگر
مدحتِ مصطفیٰ بن گئی

غزل:

وہ کرلیں ضبطِ غم کا امتحاں بھی — مرے قابو میں دل بھی ہے زباں بھی
غمِ صیاد بھی خوفِ خزاں بھی — قفس سے کم نہیں ہے آشیاں بھی
مسافر صرف ایک رہرو نہیں ہے — مسافر ہے متاعِ کارواں بھی
سنا ہے میں نے اپنا ہی فسانہ — بعنوانِ حدیثِ دیگراں بھی

عیاں ہے بوئے گل بوئے محبت
چمن میں کھل گیا رازِ نہاں بھی

☆☆☆

رفیق ساگر

محمد رفیق المتخلص بہ ساگر ۲ر فروری ۱۹۶۰ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئے، بی اے کیا اور ٹیلی فون ریونیو میں بحیثیت کلرک ملازم ہو گئے۔ ان دنوں ٹیلی فون اکاؤنٹ آفس سانگھڑ میں بحیثیت سینئر اکاؤنٹ کلرک فرائض انجام دے رہے ہیں[1]۔ سانگھڑ کے نوجواں شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ سماجی، ثقافتی اور کھیلوں کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں شادی ہوئی، اولاد میں ۲ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں، معاشی طور پر مطمئن زندگی گذار رہے ہیں ویسے بھی ہر وقت خوش خوش ہی رہتے ہیں، اکثر کبھی اپنے اور کبھی دوسرے شعراء کے اشعار گنگناتے رہتے ہیں جس سے اُن کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

طالب علمی کے دور سے شعر کہہ رہے ہیں۔ بقول ان کے، کسی سے متاثر ہو کر شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہوئے بل کہ موزونئ طبع، شوق اور لگن اس طرف کھینچ لائی، غزل کے شیدائی ہیں، آزاد نظم بھی کہتے ہیں۔ اُردو کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت سندھی، پنجابی اور سرائیکی میں بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں، ماضی میں مختلف ادبی تنظیموں سے وابستگی رہی، کئی مقامی جرائد میں کلام چھپا، مشاعرے شوق سے سنتے اور پڑھتے ہیں۔ ان کے کلام میں پختگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔

[1] حیدرآباد تبادلہ ہو گیا تھا تاہم ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

کبھی شکوے بھی تھے تجھ سے مگر اب کچھ نہیں رکھتا
جدھر کل تک بہت کچھ تھا اُدھر اب کچھ نہیں رکھتا
یہ کہہ کر میں نے اِک خالق کا خود کو رازداں رکھتا
کہ اس تخلیق میں تو نے ہنر اب کچھ نہیں رکھتا
اشاروں پہ جو چلتا تھا صدا پہ بھی نہیں لوٹا
مرے لہجے میں ہی شاید اثر اب کچھ نہیں رکھتا

غزل نمبر۲:

تری عمر ساحل پہ کٹ جائے گی — ہر اک موج واپس پلٹ جائے گی
یہ گزری ہوئی رت نے مجھ سے کہا — زباں تم نے کھولی تو کٹ جائے گی
بہت ہنس لیا تیری تصویر نے — یہ کاغذ کی صورت بھی پھٹ جائے گی
ستم ڈھائے گا غم کا ساگر بہت
یہ دھرتی جو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی

☆☆☆

روبینہ شاہینؔ

روبینہ المتخلص بہ شاہینؔ۔ ۲؍اپریل ۱۹۷۳ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئیں، گریجویشن کیا اور پرائیوٹ اسکول میں بطور معلّمہ ملازمت اختیار کرلی۔

موصوفہ کو شعر فہمی کا شعور ہائی اسکول کے دور میں نصاب میں شامل منظومات کو پڑھ کر ہی آ گیا تھا۔ قدیم اور جدید شعرأ کے مطالعے نے ذوق کی نشو و نما کی، غالبؔ، اقبالؔ، پروین شاکر اور امجد اسلام امجدؔ نے کافی حد تک متاثر کیا، طبیعت کی فطری موزونیت نے شعر گوئی پر مجبور کردیا۔ مطلوب طالبؔ سے تلمذ ہے۔ صرف غزل کہتی ہیں، ان کے اشعار میں رنج والم، ہجر و وصال اور کہیں کہیں خوشی و مسرت کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر:

دل کے اُجڑے ہوئے آنگن میں چلے آؤ تم　اتنا تڑپے ہیں صنم اور نہ تڑپاؤ تم
تیری یادوں کے سہارے ہی گذرتے ہیں دن　کبھی صورت تو دکھانے مری جاں آؤ تم
قافلہ دل کا لٹا کب ہمیں معلوم نہیں　یہی آکر کبھی ہم کو تو بتا جاؤ تم

تو نے جو روگ دیا وہ مجھے ہے جاں سے عزیز
ایسے شاہینؔ کو کچھ اور بھی تڑپاؤ تم

غزل نمبر۲:

ہجر کا غم بھی سہنا پڑے گا ضرور　دور رہ کے بھی جینا پڑے گا ضرور
گلستاں میں کہاں ہے سکوں اب ہمیں　گھر ہمیں اب بدلنا پڑے گا ضرور
وہ نظر میں بھلا نہ سکوں گی کبھی　اُس تصور میں جینا پڑے گا ضرور
آس ان کی لگانا عبث ہے یہاں　بند دروازہ کرنا پڑے گا ضرور
فائدہ کچھ نہ ہوگا وفا کا تمہیں　رات بھر چھپ کے رونا پڑے گا ضرور
وصل کی شب تڑپ بھی تو سکتی ہو تم　مل کے بھی تو بچھڑنا پڑے گا ضرور

حوصلے پست شاہینؔ کرنے سے کیا
وہ قدم آگے بڑھانا پڑے گا ضرور

☆☆☆

پورا نام ریاض احمد ہے جب کہ تبسم اور کہیں کہیں ریاضؔ بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ ۳ر فروری ۱۹۴۳ء کو بھارت کے شہر گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ بی اے، ایل ایل بی کیا۔ ۱۹۶۵ء سے سانگھڑ شہر میں اسٹامپ وینڈر کام کر رہے ہیں، ۱۹۷۲ء میں شادی کی، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ان کے زیر کفالت ہیں۔ معاشی حالات زیادہ اچھے نہیں تو بُرے بھی نہیں، متوسط زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۱۹۶۸ء سے شعر گوئی کا آغاز ہوا، حکیم شفیق الرحمان شفقؔ سے شرف تلمذ رہا، غالبؔ، اقبالؔ، فرازؔ اور منیر نیازی کو پڑھنے کا موقع ملا، ان کے کلام سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، نعت اور غزل کہتے ہیں، اب تک سو کے قریب غزلیں اور نعتیں بتاتے ہیں جنھیں جمع نہیں کر سکے، شاعری میں قدیم و جدید دونوں رنگ نمایاں ہیں، کوئی دور تھا جب مسلسل کہتے اور مشاعروں میں پڑھتے تھے آج کل غم روزگار کے سبب شعر گوئی جمود کا شکار ہے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

اعجازِ آگہی ہے کوئی داستاں رہے　　دنیا میں کوئی بات تو محکم گماں رہے
اس انجمن میں دل کی، سجا کر خیالِ دوست　　ہم آج تک بھی دوستو بے خانماں رہے
دیر و حرم میں ڈھونڈتے پھرتے تھے جو کبھی　　تقریبِ بزمِ دل میں وہی بدگماں رہے

اُن کی بلا سے کوئی ہو مشقِ ستم ریاضؔ
"کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے"

غزل نمبر ۲:

خوشی جھانکتی ہے چلمنوں سے　　رقم ہیں چاہتیں مایوسیوں سے
جنوں میں ہوش کی باتیں تعجب　　کوئی بہلا رہا ہے مدتوں سے
تلاطم اب نہیں اپنے لہو میں　　ستم گر جا چکے ہیں بستیوں سے
مآلِ ہوش نقشِ پا عکس ہے　　تعلق ہو چلا ہے پھر جنوں سے

کہاں آتی ہے [illegible] تجسم
نوائے بانکپن ٹوٹے دلوں سے

☆☆☆

ساجد زیدی

نام سید محمد ساجد زیدی اور ساجد ہی تخلص فرماتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم لاڑکانہ میں حاصل کی، جہاں ان کے والد بزرگوار نسیم زیدی کا بسلسلۂ ملازمت عارضی قیام تھا، پھر شہداد پور آ گئے۔ پوسٹ آفس میں ملازم ہو گئے۔ سلسلۂ تعلیم بھی جاری رہا، ایم اے کیا۔ شعر و سخن کی دولت ورثے میں ملی، والد صاحب سے متاثر ہیں، ابتداء میں پروفیسر نسیم حیدر نقوی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد اپنے والد صاحب سے رجوع ہوئے۔ اشعار خوب کہتے ہیں، بسا اوقات طویل بحروں میں کہتے ہیں، الفاظ سادہ اور سہل استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر غزل جب کہ نعت اور سلام میں بھی طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ مطالعے کے شوقین ہیں، اس کے علاوہ ڈرافٹ کھیلنے میں بھی مہارت حاصل ہے، جب تک یہاں رہے سانگھڑ کے مشاعروں میں خاص طور پر شریک ہوا کرتے تھے، آج کل لطیف آباد حیدرآباد میں پوسٹ آفس میں ملازمت کرتے ہیں، مستقل قیام بھی وہیں ہے۔

نمونۂ کلام

نعت:

نام محمدؐ سب کو پیارا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے
دنیا میں بے کس کا سہارا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

کفر کی بدلی چھائی جب بھی، ظلم کی آندھی آئی جب بھی
نام سے تیرے ہوا سویرا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

خود مزدوری کر کے بتائی، مزدوروں کی شان بڑھائی
مزدوروں کی آنکھ کا تارا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

مظلوموں کے ساتھی ہم ہیں، ظالم سے گھبراتا کیسا
اپنے نبیؐ کا ہم کو سہارا، کل بھی تھا اور آج بھی ہے

ختمِ نبوتؐ کے منکر کا، شانِ رسالتؐ کے منکر کا
گردش میں قسمت کا ستارہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے

غزل:

دیکھتے ہیں لوگ باہر کی طرف
کون جھانکے من کے اندر کی طرف

چاہتوں سے ہے عبارت آگہی
کیوں بڑھاؤں ہاتھ پتھر کی طرف

خواب سارے ریزہ ریزہ ہو گئے
میں پلٹ آیا مقدر کی طرف

سوچ لو کچھ کم نہیں ہیں فاصلے
آج بھی دیوار سے در کی طرف

آبلہ پا ہوں مگر با حوصلہ
جا رہا ہوں دیکھیے گھر کی طرف

☆☆☆

ستارہ انجم شیخ

نام و تخلص ستارہ انجم شیخ۔ ۲۰ رجنوری ۱۹۷۳ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئیں۔ بی۔ ایس سی کی طالبہ ہیں، متوسط گھرانے سے تعلق ہے، حال ہی میں والد صاحب کا انتقال ہوا ہے، جو گھر سے متصل کپڑے کی دکان چلایا کرتے تھے مگر سخت علالت کے سبب چند سالوں سے کاروبار بند تھا، ایک بھائی غم روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک مقیم ہے۔[1]

بچپن ہی سے حساس طبع واقع ہوئی ہیں، انسانی رویوں پر غور و فکر کی عادت بچپن ہی سے ہے، ساتویں جماعت میں تھیں جب محسوس کیا کہ اپنے احساسات کو لفظوں میں بیان کیا جانا چاہیے چنانچہ تب سے مشقِ سخن جاری ہے، کالج کے زمانے میں اپنی انگریزی کی لیکچرر محترمہ فرزانہ انجم صاحبہ سے مشورۂ سخن لیا، ان کی حوصلہ افزائی اور اصلاح سے جذبوں کو زبان ملی اور احساسات کو لفظوں میں پرونے کا شعور پہلے کی نسبت پختہ ہو گیا۔ نثر میں بھی بہت اچھا لکھ لیتی ہیں کئی افسانے مختلف جرائد و رسائل میں شایع ہو چکے ہیں، شاعری میں زیادہ تر غزل اور نظم پر توجہ ہے۔ فیض، میر، ناصر، فراز اور فرزانہ انجم سے متاثر ہیں۔ اس کے علاوہ کالج کے اساتذہ میں محمد ابراہیم صاحب اور یاسمین مری صاحبہ کی شفقتوں اور محبتوں کا ذکر عقیدت سے کرتی ہیں۔ ماہنامہ ''پاکیزہ'' میں ان کا کلام وقتاً فوقتاً شایع ہوتا رہتا ہے۔ پاکیزہ کی سال بھر کی بہترین غزل گو شاعرات میں ان کا نام بھی انعام کا حقدار ٹھہرا ہے۔ حسن و عشق کے روایتی عنوانات کے ساتھ ساتھ روز بروز گھٹتی ہوئی انسانی اقدار ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔

[1] موصوفہ کچھ عرصے سے اپنے بھائی کے پاس لندن میں مقیم ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

کیا بات ہے، دل آج پریشان نہیں ہے — رنج و غم و اندوہ کا سامان نہیں ہے
ہر چند کہ عرصہ ہوا بچھڑے ہوئے تجھ سے — ماضی کو بھلانا مگر آسان نہیں ہے
رہتا ہے مسلسل یہاں پت جھڑ ہی کا موسم — پھر فصلِ گل آئے کوئی امکان نہیں ہے
تاحدِ نظر حسن ہے رونق ہے جہاں میں — سب کچھ ہے یہاں کہنے کو انسان نہیں ہے

کچھ پیڑ بہاروں میں بھی جل جاتے ہیں انجم
سچ بات ہے بے شک کوئی ہذیان نہیں ہے

غزل نمبر ۲:

سانس بھی لینا اب تو مشکل ہے — اس مصیبت کا جانے کیا حل ہے
بے سکونی ہے بے قراری ہے — دل کے اندر عجیب ہلچل ہے
پھر بڑھے غم کے سائے شہروں میں — پھر نگاہوں میں ایک جنگل ہے
اٹھ رہا ہے دھواں سا سامنے سے — آنکھ بھی آج میری جل تھل ہے

لٹ گیا ہے قرارِ دل انجم
یاد میں دل کسی کی بے کل ہے

☆☆☆

شاہ جہاں بلبل

بیگم شاہ جہاں نام، بلبل تخلص اور ملکۂ تغزل لقب ہے۔ اصل وطن آگرہ تھا، ۱۹۵۷ء میں اپنے والد مرحوم ڈاکٹر ایم اے خانزادہ کے ہمراہ شہداد پور آئیں، ان کے والد سابقہ فوجی تھے، پولیس ٹریننگ اسکول شہداد پور میں بطور ماہر چشم ملازمت تھی، خود شعر نہیں کہتے تھے البتہ شعر فہمی کا اعلا ذوق رکھتے تھے، بیگم بلبل کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے، انھوں نے شہداد پور میں "بزمِ نعت وادب" کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی جس کی شاخیں حیدرآباد اور کراچی میں بھی قائم کیں، کراچی میں بزم کے صدر مشفق خواجہ اور سیکریٹری منظر ایوبی تھے، حیدرآباد میں صدر پروفیسر ضیاء اور سیکریٹری مسٹر خالد جب کہ شہداد پور میں بزم کے صدر عبدالستار اور سیکریٹری فاضل حیدی تھے۔ عبدالستار اگرچہ شاعر نہیں لیکن ادب نواز ضرور ہیں، شہداد پور میں ان کا "محمدی ہوٹل" ادبی محافل کی وجہ سے آج بھی مشہور ہے۔ اکثر مہمان شعراء کا قیام وطعام یہیں ہوا کرتا تھا، بلبل کے دور میں یہاں بڑے بڑے مشاعرے ہوئے جن میں ملک کے مایہ ناز شعرا شریک ہوا کرتے تھے، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں، استاد قمر جلالوی، مولانا ماہر القادری، اقبال صفی پوری، نظر حیدرآبادی، اختر انصاری اکبرآبادی، محسن بھوپالی، منظر ایوبی، عظیم عباسی، برگ یوسفی، درد سعیدی، درد اسعدی، درد بریلوی، اختر سکندری، عارفہ پروین، فاضل زیدی، ایم ایم فرشوری، یونس شرر، دور ہاشمی، پیکر واسطی، نصیر

رزّو، خالد عرفان، کرّ ار نوری وغیرہ۔

بیگم بلبل کی دو مرتبہ رسمِ تاج پوشی بھی ہوئی، پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں "بزمِ نعت و ادب" کے تحت شہداد پور میں، جب کہ دوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء میں کراچی میں ہوئی، جس میں مولانا ماہر القادری پیش پیش تھے۔ ۱۹۶۰ء میں بلبل کراچی منتقل ہو گئیں جس کے ساتھ ہی شہداد پور کی ادبی رونقیں بھی ماند پڑ گئیں، تاہم انھیں جب بھی مدعو کیا گیا وہ یہاں ضرور آئیں۔ ان کے شعر و سخن کا چرچا دور دور تک ہو چکا تھا، مختلف شہروں میں مدعو کی جانے لگیں لیکن اپنے والد کی موت کے بعد سے انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیے اور کسی بھی قسم کی محافل اور تقاریب میں جانے سے کنارا کر لیا۔

زیادہ تر غزل کہتی تھیں، ترنم خوب تھا، ہمیشہ ترنم سے پڑھتی تھیں۔ قیامِ شہداد پور کے دوران "بزمِ نعت و ادب" کے زیرِ اہتمام ایک کتاب چہ بعنوان "بلبل کے سو اشعار" شائع ہوا تھا، جو اب دست یاب نہیں ہے اور نہ ہی ان کا کلام ہاتھ آ سکا ہے، صرف چند اشعار ملے ہیں جنھیں بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

نمونۂ کلام

غزل:

آپ کا دل ہے کینہ ساز
بس چپ رہیے بندہ نواز

باتوں باتوں میں برہم ہیں
آپ اٹھائیں گے کیا ناز!

باتوں باتوں میں بہلایا
کچھ نہ گھٹایا سوز و گداز

اور بلندی پہ اُڑتی چل
بلبل اور اونچی پرواز

☆☆☆

مذکورہ بالا معلومات "بزمِ نعت و ادب شہداد پور" کے سابق صدر عبدالستار (محمدی ہوٹل) اور سیکریٹری فاضل حیدری، عارف، اسلام الدین آزاد اور ادبی مجلہ "شہر سخن" سے حاصل کی گئی ہیں۔

شمیم احمد شمیم

۱۹۶۰ء میں شہداد پور میں پیدا ہوئے، اسلامی کلچر میں ایم اے کیا، والد کے انتقال کے بعد گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آن پڑا۔ ملازمت کا انتظار کیے بغیر بک ڈپو قائم کیا۔

۱۹۷۶ء میں پروفیسر شوکت اللہ خان جوہر شاہ جہاں پوری کی تحریک پر شعر وسخن کی دنیا میں آئے، ابتداء میں ان سے ہی اصلاح لی، بعد ازاں پروفیسر فدا انصاری اور حسان دانش سے مشورۂ سخن کرنے لگے، کالج کے زمانے میں سرگرمی سے شعر کہتے تھے۔ آج کل بہت ہی کم کہتے ہیں، غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔

نمونۂ کلام

غزل:

سیرِ گلشن کو طرح دار آیا کلیاں کہتی ہیں شہریار آیا
کس نے کی ہم پہ جلوہ ارزانی بام پہ کون بار بار آیا
دیکھ کر حالتِ مریضِ غم جو بھی آیا سو اشک بار آیا
روشنی ہی سی روشنی پھیلی بزم میں جوں ہی دل بہار آیا
کوئی تجھ کو خبر بھی ہے مالی بھونرا کتنے گلوں کو مار آیا

تیرے آنے سے رُخ پہ باد شمیم
غم کے ماروں پہ کچھ نکھار آیا

☆☆☆

شمیم رضوی

نام و تخلص شمیم رضوی، ۱۰؍ستمبر ۱۹۲۹ء کو سید پور، الہ آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ میٹرک الہ آباد اور انٹر کراچی سے کیا، جنگ اخبار سے وابستہ تھے۔ ۱۹۵۵ء میں تبادلہ ہو کر سانگھڑ آئے، اپنے احباب میں بابو شمیم کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں مستقل طور پر سانگھڑ منتقل ہو گئے، اسی سال سے شعر کہنا شروع ہوئے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

عشق کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں
حسن بک جاتا ہے یوسف تہِ دام آتے ہیں

خوش بو آتی ہے بہاروں کے سلام آتے ہیں
اُن کی جانب سے مجھے کتنے پیام آتے ہیں

دن ڈھلے سائے مری منتظر آنکھوں کے لیے
لے کے دامن میں ستاروں بھری شام آتے ہیں

مدتیں گزری ہیں غرقاب ہوئے مجھ کو شمیم
آج بھی بحرِ ظلمات کے سلام آتے ہیں

غزل نمبر ۲:

دکھا سکے نہ جو منزل وہ رہبری کیا ہے
مٹا سکے جو نہ ظلمت وہ روشنی کیا ہے

یہ رات صحنِ گلستاں میں بے نقاب تھے آپ
ستارے پوچھ رہے تھے یہ روشنی کیا ہے

ذرا سا دور بھی تم میرا ساتھ دے نہ سکے
یہ دوستی ہے تو معیارِ دشمنی کیا ہے

لبوں پہ ذکرِ جفا، سانپ آستینوں میں
اگر یہ رسمِ حرم ہے تو آذری کیا ہے

میں اُن کے غم کے سہارے سے جی رہا ہوں شمیم
متاعِ دوست ہے اور میری زندگی کیا ہے

☆☆☆

شوکت اللہ خان جوہرؔ شاہ جہاں پوری

نام شوکت اللہ خان، تخلص جوہرؔ، شاہجہانپور میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے، ابتداء میں جگر مراد آبادی سے اصلاح لی ان کے بعد حکیم ظفر حسین لکھنوی اور عارف سنبھلی سے رجوع ہوئے۔ان کی وفات کے بعد اعجاز جودھپوری اور قیصر رام پوری سے شرف تلمذ رہا، ملازمت کے سلسلے میں شہداد پور آئے جہاں مقامی کالج میں اُردو کے استاد کے طور پر خدمات انجام دیں، تقریباً پانچ چھ برس یہاں رہنے کے بعد کراچی تبادلہ ہو گیا، آج کل وہیں مقیم ہیں۔ زود گو شاعر ہیں، قدرت کی طرف سے طبیعت بھی موزوں پائی ہے، مزاج میں ظرافت کا عنصر ہے، شاعری میں قدیم وجدید دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ غزل کے بہترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ شہداد پور میں ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے ان کی کوششیں بھی قابلِ قدر ہیں، ان کے کئی شاگرد اب بھی شعر وادب کی محفلیں سجا رہے ہیں۔ان کا ایک مجموعہ کلام بھی طبع ہوا ہے جو میری نظر سے نہیں گذرا تاہم ملکی جرائد میں ان کی غزلیات طبع ہوتی رہتی ہیں، معیاری شعر کہتے ہیں، کلام کی پختگی ان کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

سرِ صحرا جو دیوانے چلے ہیں خرد مند ان کو بہکانے چلے ہیں
بنے گا ان کا گھر گہوارۂ امن جو دیوارِ ستم ڈھانے چلے ہیں
کوئی دیکھے تو ان غنچوں کی قسمت جو بن کر پھول مرجھانے چلے ہیں
نہیں واقف جو اپنے رہبروں سے وہ گھر سے ٹھوکریں کھانے چلے ہیں
غمِ دوراں نے کیا کیا راہ روکی جب ان کی زلف سلجھانے چلے ہیں

انھیں خود کو گنوانا ہوگا جوہر
کسی کا عشق جو پانے چلے ہیں

غزل نمبر۲:

وہ شوخ مرے حال سے آگاہ نہیں ہے ملنے کی بہ ظاہر بھی کوئی راہ نہیں ہے
سرگوشیاں کرنے لگے شمشاد صنوبر وہ جانِ چمن آج جو ہمراہ نہیں ہے
ساقی حقارت نہ مجھے چاہیے ساغر لے جا اسے واپس کر مجھے چاہ نہیں ہے
روکا ہے مجھے آپ نے مے خانے کے در پر کیا رند کو یہ صدمۂ جانکاہ نہیں ہے

پُرکیف تصور میں بہک جاتا ہے جوہر
پابند شریعت ہے یہ گمراہ نہیں ہے

☆☆☆

ضیاء عزیزی

نام سید خورشید علی، تخلص ضیاء، اور اپنے استاد حافظ یوسف علی خان عزیز کی نسبت سے عزیزی لکھنا شروع کیا۔ ۱۲/مارچ ۱۹۲۳ء کو جے پور شہر میں پیدا ہوئے۔ یہیں سے میٹرک کیا اور ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ اس طرح مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ قیام پاکستان کے بعد شہداد پور میں مستقل رہائش اختیار کی، محکمۂ ریونیو میں بحیثیت جونیئر کلرک ملازم ہو گئے، اور ترقی پا کر آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچے۔ دو شادیاں کیں تھیں، پہلی بیوی ہجرت کے دوران داغ مفارقت دے گئی، دوسری شادی پاکستان آنے کے چند سالوں بعد کی، دونوں بیویوں سے اولادیں ہیں۔

بچپن میں حافظ یوسف علی خان عزیز جو کہ پڑوس میں رہتے تھے، کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے ان ہی کی صحبت کا اثر ہوا اور طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئی، چنانچہ ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ جے پور کے مشاعروں میں کلام پڑھا کرتے تھے، ان ہی دنوں آل انڈیا مشاعرے میں کلام پڑھنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی اگرچہ ملازمت کی وجہ سے بہت کم وقت میسر آتا تھا تاہم ضلع سانگھڑ کے مشاعروں کے لیے وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ بزمِ ادب شہداد پور کے خاص کرم فرماؤں اور "دیارِ سخن" کے مرتبین میں شامل ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

ہماری سرزمینِ پاک میں دشمن در آئے تھے
اسی شب ہم نے عزمِ خاص کے سورج جگائے تھے
قیامت ساز ہنگامے وہ اپنے ساتھ لائے تھے
مگر ہم نے مقابل میں نئے محشر اُٹھائے تھے
جوان و پیر و کم سن، سب بھرے گھر سے نکل آئے
کماں تھی باپ کے ہاتھوں میں بچے تیر لائے تھے
ہمارے پاس تکبیر و رسالتؐ کی صدائیں تھیں
خودی و بے خودی، اقبال جس کے ساتھ آئے تھے

غزل نمبر۲:

یہاں انساں ہی انساں کو انسان کہتے ہیں — مگر سارے جہاں والے مجھے نادان کہتے ہیں
الٰہی ایک میں ہی حاملِ بارِ امانت تھا — اِسی بارِ امانت کی مجھے پہچان کہتے ہیں
زمین و آسماں حیران تھے میری جسارت پہ — ترے جلوؤں کے آئینے مجھے انسان کہتے ہیں
کوئی قربان ہے ان پر کوئی بے زار ہے اُن سے — ہم اپنی آرزوؤں کا اُسے بحران کہتے ہیں

ضیاؔ جب عید ملتا ہوں بروزِ عید لوگوں سے
پُرانی آشنائی کو نئی پہچان کہتے ہیں

☆☆☆

ظفر بخاری

نام محمد، تخلص ظفرؔ ہے۔ ۷ اراگست ۱۹۳۵ء کو قصبہ نرور پٹی، الہٰ آباد، یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کراچی اور پھر ۱۹۴۸ء کے اواخر میں شہدادپور آئے، انٹر تک تعلیم حاصل کی، ملازمت کے بجائے اخبار فروشی کو ترجیح دی، ہنوز اسی پیشے سے منسلک ہیں، جنگ سمیت کئی بڑے اخبارات کی ایجنسیاں ان کے پاس ہیں۔

اسکول کے زمانے میں بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے، یہیں سے طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی، فلکؔ الہٰ آبادی سے اصلاح لی، بعد ازاں پروفیسر نعیم حیدر تقویؔ کے تلامذہ میں شامل ہوئے، اُن ہی کی تحریک پر مشاعرے پڑھنا شروع کیے۔ مجموعی طور پر غزل کے شاعر ہیں تاہم شاعری کی ہر صنف پر ہی طبع آزمائی کی ہے، قطعات کہنے میں بھی کمال حاصل ہے، اب تک سینکڑوں غزلیں کہہ چکے ہیں۔

گھریلو حالات مناسب و موزوں ہیں۔ بچپن ہی سے گھریلو ذمے داریوں کو سندھ دیتے آرہے ہیں، اخبار فروشی کو ذریعہ معاش بنانے کے بعد سے حالات قدرے سازگار ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

روٹھ جائے گی زمانے سے سحر میرے بعد
ہوگا تاریک محبت کا نگر میرے بعد

کون سا سر یہاں پتھر کے مقابل ہوگا
کون ٹکرائے گا دیوار سے سر میرے بعد

اپنے ہر ایک ستم پر وہ پشیماں ہوں گے
ہوگا پیدا میری آہوں میں اثر میرے بعد

رونق بزم جہاں میرے ہی دم سے قائم
ماند پڑ جائیں گے یہ شمس و قمر میرے بعد

میں نہ ہوں گا تو انھیں کون بھلا چاہے گا
کون لے گا بڑے پیاروں کی خبر میرے بعد

ہنس کے سینے سے لگائے ہیں زمانے کے ستم
لوگ پائیں گے کہاں مجھ سا ظفر میرے بعد

غزل نمبر ۲:

خودی کی ہو جہاں توہین دیوانے نہیں جاتے
نہ ہو گر ضبط ساقی میں تو مے خانے نہیں جاتے

بدل دیتی ہے صورت بھی، معیت ایسی ہوتی ہے
غم و آلام کے مارے تو پہچانے نہیں جاتے

ادھر ہم سے محبت اور اُدھر اغیار سے رشتہ
ہمارے دور کے محبوب پہچانے نہیں جاتے

یقیناً آج پھر تاریخ عالم اور کچھ ہوتی
اگر بڑھ بڑھ کے سوئے دار دیوانے نہیں جاتے

خدا سے خیر کی اب تو دعا مانگیں ظفر صاحب
کبھی جو جانے پہچانے تھے پہچانے نہیں جاتے

☆☆☆

ظہیر احمد تشنہ

ظہیر احمد المتخلص بہ تشنہ ۱۰ رمارچ ۱۹۶۷ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد غمِ روزگار کے حوالے ہو گئے۔ الیکٹریشن کا کام جانتے تھے چناں چہ اسی پیشے سے وابستہ رہے۔

۱۹۸۴ء میں ساحر لدھیانوی کو پڑھنے کے بعد شعر گوئی کا ذوق ہوا، ابتداء میں شریف تیر سے اصلاح لی، لیکن بقول اُن کے دل مطمئن نہیں ہوا، اس لیے پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ دین کی طرف رغبت زیادہ ہونے کے بعد سے غزل کہنا ترک کر دیا البتہ نعت اور نظم میں طبع آزمائی جاری رکھی۔

ابتداء میں سانگھڑ شہر کی سطح پر منعقدہ مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے اور کلام پڑھتے تھے لیکن بعد میں یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے تھے کہ "میں شاعر نہیں ہوں"۔

نمونۂ کلام

نعت کے اشعار:

بلبل چہکی کلی بھی چٹکی نعت نبیؐ کی سنانے کو
آج فضا بھی مہک رہی ہے گیت خوشی کے گانے کو

دل کو یہ محسوس ہوا ہے آنکھوں نے بھی دیکھا ہے
عرش زمیں پہ آ اترے ہیں رخِ انور دکھانے کو

آج یہ ناچے پاؤں گائے، گھنگھرو باندھ دھمالیں ڈالے
آج تو واعظ کچھ مت کہہ تو طیبہ کے مستانے کو

☆☆☆

عبدالرحمٰن دانش

نام عبدالرحمٰن، تخلص دانشؔ۔ ۱۹۵۰ء میں شہداد پور میں پیدا ہوئے، باپ دادا کا تعلق ریاست پٹیالہ، مشرقی پنجاب (بھارت) سے تھا جو تقسیم ہند کے فوراً بعد یہاں چلے آئے تھے۔ ایم۔ اے اُردو ادب میں کرنے کے ساتھ ساتھ D.H.M.S کا کورس بھی کیا۔ ملازمت کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوئی، اپنا ذاتی مطب قائم کیا، جہاں دندان سازی کا کام کرتے ہیں۔

شاعری کا شوق دورانِ تعلیم ہوا۔ بیدارؔ رام پوری کے تلامذہ میں سے ہیں جب کہ غالبؔ اور میرؔ کے مداح ہیں۔ اُردو، سندھی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، صاحبِ دیوان ہیں، ان کا شمار شہداد پور کے ابتدائی فعال شعراء میں ہوتا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ مختلف مضامین اور رومانوی داستانیں بھی لکھیں جو مختلف جرائد "نوائے وقت"، "امروز"، "اخبارِ خواتین"، "اعلان" اور "جنگ" میں شائع ہو چکی ہیں۔ ماضی میں "بزمِ شمعِ ادب" اور "آبگینۂ ادب" جب کہ آج کل "المشرق آرٹ اکیڈمی" سے منسلک ہیں[۱]۔ "دیارِ سخن" اور "گلزارِ سخن" نامی مجموعوں کے مرتبین میں بھی نام ملتا ہے۔ نعت، حمد، مرثیہ اور ملی نغمات میں طبع آزمائی کی ہے، اب تک ان کے دو مجموعے "سفرِ دانش" (اردو) اور "مہرِ دانش" (سندھی) شائع ہو چکے ہیں، جب کہ طنز و مزاح اور نعتوں پر مشتمل دو مجموعے بالترتیب "گڑبڑ گھوٹالہ" اور "عقیدتِ دانش" منتظرِ اشاعت ہیں[۲]۔

---

[۱] فاضل حیدری کی وفات کے ساتھ ہی یہ اکیڈمی بھی غیر فعال ہو گئی۔ [۲] موصوف کے چار دیگر مجموعہ ہائے کلام "عقیدتِ دانش"، "گلدستۂ دانش"، "زخم چاہت کے" اور "دکھوں کی بارش" شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

آیا نہ راس زیست کا کوئی سفر مجھے
کانٹوں سے پُر ملی ہے ہر اک رہ گزر مجھے

مایوس کر رہے ہیں غموں کے بھنور مجھے
کوئی کرن اُمید کی آئے نظر مجھے

کیوں رنگ کائنات کے پھیکے سے پڑ گئے
ویراں ملی ہے زیست کی کیوں ہر سحر مجھے

رسوا کریں خیال تھا یہ اہل شہر کا
لیکن مرے جنوں نے کیا معتبر مجھے

واثق دعائیں دیتا ہوں اس بے وفا کو میں
اپنا بنا کے جس نے کیا دربدر مجھے

غزل نمبر ۲:

خوف کا ہے اب فضاؤں پر اثر بکھرا ہوا
اس لیے ہر شخص ہے اب شہر کا لرزا ہوا

ہو گئیں تبدیلیاں کچھ اس طرح ماحول میں
دیکھتا ہوں خود کو بھی اس آگ میں جلتا ہوا

غم کے صحراؤں کو یہ سیراب کرتا ہی رہے
آرزو کے چاک دامن سے لہو رستا ہوا

سب ہوئے خاموش یہ کیسی زباں بندی ہوئی
پھول کانٹوں کے نگر میں ہے مگر سہما ہوا

کس بھنور میں چھپ سکے گا زخم تیری یاد کا
چاند بن بن کر جو پیشانی پہ ہے اُبھرا ہوا

اس کا واثق کب تلک کرتے رہو گے انتظار
چاند بھی سورج بھی اپنے وقت پہ چلتا ہوا

☆☆☆

عبدالستار انصار

عبدالستار نام، انصار تخلص، ۱۹۳۹ء میں بھارت کے ضلع بھیلواڑہ میں پیدا ہوئے، قیام پاکستان کے فوراً بعد ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آئے، جہاں ۱۹۵۶ء تک مقیم رہے بعد ازاں سانگھڑ کے قریب جھول میں منتقل ہو گئے۔ دو شادیاں کیں، پہلی ۱۹۶۱ء میں انجام پائی مگر بدقسمتی سے ایک ہی سال بعد زچگی کے دوران زچہ و بچہ دونوں انتقال کر گئے۔ ۱۹۶۵ء میں دوسری شادی کی، اولاد میں ۶ بیٹیاں اور ۵ بیٹے ہیں۔ موصوف خود صرف تین درجے پاس ہیں مگر ان کی تمام بچے نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بل کہ چند ایک تو اعلا سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہیں۔

شعر و ادب کا ذوق ۶۳۔۱۹۶۲ء میں ہوا، ابتدا میں نعت گوئی کی جانب راغب ہوئے، بعد ازاں تمام ہی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ مسلم لیگ کے لیے بھی چند ایک نغمات لکھے، ایک نغمے کی پسندیدگی پر سابق وزیر اعلا پنجاب غلام حیدر وائیں مرحوم نے انھیں تعریفی خط بھی ارسال کیا نیز ان کے اسی ترانے کو مسلم لیگ کے ترانوں کا انتخاب کرنے والی "چودھری ظہور الٰہی شہید ایوارڈ کمیٹی" نے اپنے ایک مجموعے کے لیے منتخب کیا۔ اس کے علاوہ ان کے کئی ملی نغمات اور نعتیں مختلف رسائل اور جرائد کی زینت بھی بنیں۔

نمونۂ کلام

نظم:

اے سندھ کے جیالو، خود کو ذرا سنبھالو
تم سندھ کے امیں ہو اب سندھ کو بچالو
تفریق کا اٹھا ہے اک شور انقلابی
سب منتشر ہیں قومیں، ہے ذہنی اضطرابی
ان فرقہ بندیوں کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالو
اے سندھ کے جیالو، خود کو ذرا سنبھالو
ہے وقت کا تقاضا مل کر رہیں صدا ہم
جیسے فلک کے تارے رہتے ہیں مل کے باہم
تاریکیاں مٹادو، تعمیر کے اُجالو
اے سندھ کے جیالو، خود کو ذرا سنبھالو
ہم اس کا بخت ہیں، یہ تقدیر ہے ہماری
ہم اس کا خواب ہیں یہ تعبیر ہے ہماری
انصارؔ اس کا دامن تاروں سے تم سجالو
اے سندھ کے جیالو، خود کو ذرا سنبھالو

غزل:

افسوس نسلِ انساں، انساں مٹا رہا ہے
خود اپنے ہاتھوں اپنا لاشہ اُٹھا رہا ہے
روشن تھی جا بجا جو علم و عمل کی شمع
تخریبِ عمل سے اُس کو بجھا رہا ہے
پیار و وفا کے نغمے، اخلاص کے ترانے
کیوں نفرتوں کے ہاتھوں سب کچھ بھلا رہا ہے
تھی زندگی جہاں پر اب موت کا ہے مسکن
جانے یہ آج انساں کس سمت جا رہا ہے
انسان مر رہا ہے، انسان مر گیا ہے
انصارؔ کس کو اپنی چتا سنا رہا ہے

☆☆☆

عبدالقدیر سخاؔ

شہداد پور میں پیدا ہوئے۔ کالج کے زمانے میں پروفیسر شوکت اللہ جوہرؔ صاحب کی تحریک پر شعر کہنے لگے، اُن ہی سے اصلاح لی۔ اُن کے دور میں تندہی سے شعر کہتے تھے، آج کل پہلے والا جوش اور ولولہ نہیں رہا، کراچی میں بسلسلۂ ملازمت عارضی قیام ہے، محکمۂ تعلیم سے منسلک ہیں۔

غزل اور نعت کہتے تھے، ترنم خوب تھا، آج کل مشاعرے نہیں پڑھتے اور بہت کم کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل:

مینا کے ساتھ دوستو پیمانہ بھی ہوگا
ساقی کے گھر کے ساتھ ہی مے خانہ بھی ہوگا

مجھ کو شراب خانے میں لے تو چلے ہیں آپ
پیرِ مغاں کا طور شریفانہ بھی ہوگا

غیروں سے اختلاط وہ رکھتے ہیں رات دن
ہم بے کسوں پہ لطف کریمانہ بھی ہوگا

خانہ خراب راہ گزر میں پڑا رہے
بدنام پھر تو آپ کا کاشانہ بھی ہوگا

محفل کی شمع ہو گئی گل کس کی آہ سے
بھڑکا چراغ گورِ غریبانہ بھی ہوگا

☆☆☆

عبدالقیوم نویدؔ

عبدالقیوم المتخلص بہ نویدؔ ۱۶ رفروری ۱۹۴۰ء کو قصبہ دائرہ بے پور (بھارت) میں پیدا ہوئے، قیام پاکستان کے فوراً بعد شہداد پور ہجرت کی نامساعد حالات کے سبب صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکے، بعد ازاں ملازمت کرلی، بلدیہ شہداد پور میں بطور کلرک فرائض انجام دینے لگے، شادی ؟ کی اور اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے۔

۱۹۷۰ء سے شعر کہنا شروع کیا، بقول ان کے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی، تاہم غالبؔ، اقبالؔ اور سراج الدین ظفرؔ سے متاثر ہیں۔ اُن کے کلام کے مطالعے ہی نے شعر گوئی پر مجبور کیا، زیادہ تر غزل کہتے ہیں، البتہ نعت اور نظم میں بھی طبع آزمائی فرما لیتے ہیں۔ مقامی مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے اور کلام پڑھتے تھے۔ علاوہ ازیں مقامی جرائد و رسائل میں بھی چھپتے رہے ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

کرتے ہیں محبت کے جو افسانے رقم لوگ　　ملتے ہیں ہمیں آج بھی دنیا میں وہ کم لوگ

ہم اپنے مقدر کو بگاڑیں یا سنواریں　　وہ لوح و قلم رکھتے ہیں تحویل میں ہم لوگ

ہر جادۂ دشوار سے گزرے جو نہ ہوتے　　ہر خارِ مغیلاں پہ یوں رکھتے نہ قدم لوگ

یہ لفظِ محبت بھی یہاں عام نہ ہوتا　　رکھتے نہ اگر عشق کی راہوں میں قدم لوگ

ثانی نہ کبھی ہوگا کوئی شاہِ سلیمان

ہم سر تو بہت ہوں گے یہاں قیصر و جم لوگ

غزل نمبر ۲:

مری قسمت میں یوں تو غم بہت ہیں　　ہر اک غم کے لیے پر ہم بہت ہیں

دلایا یاد جو ملنے کا وعدہ　　وہ میری بات سے برہم بہت ہیں

ضرورت پہ ہمیں بھی آزمانا　　بہ ظاہر تو ترے ہمدم بہت ہیں

مداوا ہم لے بیٹھے تھے غم کا　　مگر خود شاعری میں غم بہت ہیں

تبسم ہے ترے ہونٹوں پہ لیکن

تری آنکھوں کے گوشے نم بہت ہیں

☆☆☆

عبداللہ خان دریاہ آزاد[1]

یکم مارچ ۱۹۵۰ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ ضلع کی سرکردہ سیاسی، علمی اور ادبی شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد کئی سالوں کی انتھک محنت اور جانفشانی کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ بعنوان "تاریخ، آثار قدیمہ اور مسکوکات" لکھ کر سندھ یونیورسٹی میں جمع کروایا[2]۔ متعدد تحقیقی و تنقیدی مقالے مختلف سندھی، اردو اور انگریزی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۵ء میں کیا، اسد اللہ شاہ محبوب ترمذی المعروف بہ شاہ اسد اور مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ سے اصلاح لی، شاہ عبداللطیف بھٹائی، استاد بخاری، مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ، عبدالحمید عدمؔ اور پروین شاکر پسند و معیار ٹھہرے۔ سندھی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کی تاہم بہت کم کہا ہے۔ ٹنڈو آدم میں چند ایک مشاعرے، ان کی صدارت میں اور چند ایک ان کے تعاون سے منعقد ہو چکے ہیں، ایک مشاعرے میں جو ۱۹۹۹ء کے لگ بھگ ان کی اوطاق پر منعقد ہوا تھا میں نے بھی کلام پڑھا تھا اور شاید یہ میرا پہلا یا دوسرا مشاعرہ تھا، اسی مشاعرے کے بعد ان سے گاہے گاہے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت، علم و ادب سے وابستہ لوگوں کی قدر دانی اور عزت افزائی کے اوصاف حمیدہ سے متصف ہے۔ علاوہ ازیں سانگھڑ ہسٹاریکل اینڈ کلچرل سوسائٹی، سندھ ہسٹاریکل اینڈ کلچرل سوسائٹی اور محکمۂ آثار قدیمہ و عجائب گھر میں ان کی گراں قدر خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

---

[1] موصوف ۳۱ مئی ۱۹۹۹ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ [2] وفات کے بعد پی ایچ ڈی کا معاملہ ادھورا رہ گیا۔

نمونۂ کلام

الٰہی ملک و ملت کو سدا آباد رکھنا تو
اسے بارانِ رحمت میں ہمیشہ یاد رکھنا تو
کرم سے تیرے قائم ہے، تو ہی اس کی حفاظت کر
قیامت تک رہے باقی، اسے آزاد رکھنا تو

تری یادوں کی اک دنیا نئی میں نے بسائی ہے
اگرچہ دور ہوں تم سے، تمہیں سے دل لگائی ہے
نگاہوں میں بسے ہو تم سمائے میری سوچوں میں
ترے جذبوں نے اب امید کی شمع جلائی ہے

☆☆☆

سندھی کی رعایت سے "دل" کو مؤنث باندھا ہے۔

عقیل الدین شاکر

نام عقیل الدین، تخلص شاکر اور پیشہ حکمت ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں قرولی، راجستھان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والدین، ان کی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آ گئے اور پھر یہیں آباد ہوئے۔ اردو ادب میں ایم اے کے ساتھ ساتھ بی یو ایم ایس کیا۔ آج کل اپنا ذاتی مطب کرتے ہیں۔

ساتویں جماعت میں تھے کہ شاعری میں غور و خوض کرنے لگے اور میٹرک کے بعد سے باقاعدہ شعر کہنا شروع ہوئے۔ مسعود احمد عزیز، بصیر احمد بصیر اور اصغر وارثی سے اصلاح لی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

خوابیدہ حسرتوں کو جگاتی ہے چاندنی
بیتے دنوں کی یاد دلاتی ہے چاندنی

کرتی ہے تجھ سے دور جو تارِ شبِ فراق
اکثر ترے قریب بلاتی ہے چاندنی

مخمورِ چشمِ یار سے پیتا ہے پہلے چاند
پھر وہ شراب مجھ کو پلاتی ہے چاندنی

ذوقِ نظر کے ساتھ جو حساس دل بھی ہو
ہل چل ہر ایک دل میں مچاتی ہے چاندنی

غزل نمبر ۲:

غربت میں ہوں لیکن مجھے آرام بہت ہے
مجھ پر مرے اللہ کا انعام بہت ہے

اے اہلِ ہوس تم کو مبارک مے و ساغر
مجھ کو مئے توحید کا اک جام بہت ہے

کچھ لوگوں کی عادت ہے کہ کرتے نہیں کچھ کام
منہ سے یہی کہتے ہیں ہمیں کام بہت ہے

اب مجھ پہ کوئی اور نہ الزام لگاؤ
انسان ہوں مجھ پر یہی الزام بہت ہے

ہم نے تو کوئی عیب بھی شاکر میں نہ دیکھا
دنیا یہی کہتی ہے وہ بدنام بہت ہے

☆☆☆

فاروق صادق

فاروق صادق ۱۷ر جولائی ۱۹۶۳ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئے۔ بی اے کے بعد DHMS کیا۔ ۱۹۹۰ء سے شعر و ادب سے وابستہ ہیں۔ نیشنل رائٹرز فورم شہداد پور کے چیئرمین، جب کہ مجلّہ ''کنول'' کے مدیرِ خصوصی بھی رہ چکے ہیں۔ غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

ہوا کا زور تھا، بوڑھا شجر لرزتا تھا
اسی شجر پہ پرندہ بھی سہما بیٹھا تھا

طلوعِ صبحِ درخشاں تھا جھیل میں ایسا
کرن کے لمس سے پانی میں ساز بجتا تھا

اندھیری رات کے سائے سے کھیلتا تھا چاند
دیارِ شب سے بہت دور دور رہتا تھا

جو رات ڈھونڈنے نکلا تھا تیری بستی کو
وہ میں تھا، یا مرا سایہ تھا یا کہ رستہ تھا

ہوائیں دور جزیروں سے لوٹ آئیں تھیں
وہ گیلی ریت کے ساحل پہ تنہا بیٹھا تھا

غزل نمبر۲:

رنگ، خوش بو، بہار کی باتیں
میرے اس طرح دار کی باتیں

صاحبِ دل نگار کی باتیں
یاد آتی ہیں پیار کی باتیں

تیرا ملنا، ترا نہیں ملنا
پھول کھلنے کی خار کی باتیں

تیری چاہت کے دل نشیں قصے
کرمِ بے شمار کی باتیں

وہ مری یاد کا حسیں گلشن
وہ ترے انتظار کی باتیں

ذکر اس اعتبار کا صادق
محو سایۂ دار کی باتیں

☆☆☆

فاضل حمیدی

نام اشہد میاں، فاضل تخلص اور اپنے استاد حمید عظیم آبادی کی نسبت سے حمیدی لکھتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں آنولہ ضلع بریلی (بھارت) میں ایک علمی، ادبی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم قبلہ مفتی محمد عبدالحمید ایک بلند پایہ عالم و طبیب تھے۔ ابتدائی تعلیم تحصیل پرائمری اسکول آنولہ سے جب کہ عربی، فارسی اور صرف و نحو میں اپنے والد سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں شہدادپور آ کر مستقل سکونت اختیار کی۔ ۱۹۵۱ء میں مشرقی تعلیم اور مولوی کی سند حاصل کرنے کے لیے جامعہ رضویہ مظہرالاسلام فیصل آباد میں معروف عالم دین و خطیب مولانا سردار احمد صاحب (محدث پاکستان) کی خدمت میں پیش ہوئے۔

طبیعت میں فطری طور پر شعر و شاعری سے رغبت کی بنا پر اُردو ادب کی جانب متوجہ ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں نواب شاہ کے معروف شاعر جناب حمید عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ شہدادپور میں المشرق آرٹ اکیڈمی کے نام سے ایک ادبی و ثقافتی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ اس اکیڈمی کے تحت قومی و مذہبی تقریبات، ادبی مذاکرے، مشاعرے اور مشاہیر کی یاد میں پروگرام منعقد کیے۔ علاوہ ازیں نعتوں کا مجموعہ "ﷺ" "اطہر جعفری کا شعری مجموعہ" "ملاحظہ فرمائیے"، "آئینۂ مشرق"، "آئینۂ شہدادپور"، "عکسِ شہدادپور" اور "شہر سوالی" جیسے علمی ادبی مجلات کے علاوہ شہدادپور کی سطح پر ٹیلی فون ڈائریکٹری اور شاپنگ گائڈ وغیرہ شائع کیں۔

فاضل صاحب نے، نہ صرف شاعر بلکہ ادیب، ڈرامہ نویس اور بہترین منتظم کے طور پر شہرت پائی

اور شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

جو کارِ خیر کا کچھ اہتمام کر لیں گے　　تو اس جہان میں اپنا وہ نام کر لیں گے
یوں ہی رہا جو سلامت ہمارا جذبۂ شوق　　تو انجمنوں کو بھی ہم زیرِ دام کر لیں گے
بیک اشارۂ ابرو تمہارے دیوانے　　خرد سے جو نہ ہوا ہے وہ کام کر لیں گے
خلوصِ دل سے پلاتا رہا اگر ساقی　　تو ہم بھی زیست کو پیمانہ جام کر لیں گے

یوں ہی رہی جو یہ سرگرمیِ سفر فاضل
ہم اپنا آپ ہی پیدا مقام کر لیں گے

غزل نمبر ۲:

جانا بھی بہت دور ہے منزل بھی کڑی ہے　　ہم کس کی خبر لیں ہمیں اپنی ہی پڑی ہے
جینے کی ہوس ہے نہ مجھے موت کا ڈر ہے　　میں وہ ہوں کہ یزداں سے مری آنکھ لڑی ہے
میں بھولنا چاہوں تو بھلا بھی نہیں سکتا　　کہنے کو نہیں کچھ بھی مگر بات بڑی ہے
وہ شے کہ جو شاہوں کو بھی حاصل نہیں ہوتی　　رندانِ بلا نوش کے قدموں میں پڑی ہے

فاضل نے پلایا ہے لہو اپنے جگر کا
اشعار میں تب جا کے ذرا جان پڑی ہے

☆☆☆

۱۔ ۲۹ جولائی ۲۰۰۷ء کو وفات پائی۔ ۱۹۹۹ء میں پروفیسر نگہت ذیبا نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک مجلہ "اعتراف" شائع کیا۔ جب کہ ۲۰۰۸ء میں سیدہ ہما علی شاہ نے ان کی شخصیت اور فن پر ایم اے کا مقالہ تحریر کیا۔

فداؔ انصاری

ڈاکٹر فداؔ حسین انصاری، فداؔ تخلص فرماتے ہیں۔ ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء کو قصبہ آنولہ ضلع بریلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ باپ دادا کا پیشہ تجارت تھا، ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی، پہلے نواب شاہ پھر سکھر اس کے بعد شہداد پور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ معاشیات اور اُردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۹۲ء میں پروفیسر ڈاکٹر نجم الاسلام کی زیرِ نگرانی اُردو میں پی۔ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۶۳ء سے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہیں ان دنوں گورنمنٹ ڈگری کالج شہداد پور میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تعینات ہیں[1]۔

شعر فہمی کا شوق کالج کے زمانے میں پروفیسر نعیم حیدر تقویؔ مرحوم کے ذوقِ شعر گوئی سے متاثر ہو کر ہوا چنانچہ شروع شروع میں اُن ہی سے اصلاح لی۔ اُن کے بعد مولانا محمد اسماعیل صادقؔ مرحوم اور محترم کاملؔ حیدری سے رجوع ہوئے۔ اب تک درجنوں غزلیں، نعت و سلام اور نظمیں کہہ چکے ہیں، نثر میں بھی کمال حاصل ہے۔ مختلف شعراء جن میں رحیم عیاںؔ، جمیل نظرؔ، مونسؔ انصاری، اعجازؔ قریشی، مقبولؔ عابدی، محمد حسین تحرؔ، خالد عرفان اور اطہرؔ جعفری شامل ہیں کے دواوین پر تنقیدی تبصرے رقم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ "آئینہ شہداد پور" نامی ادبی پرچے کے مدیر بھی رہے۔ ضلع سانگھڑ کے شعراء کے منتخب کلام پر مبنی مجموعہ "دیارِ سخن" کے مرتبین میں بھی ان کا نام شامل ہے۔

---

[1] چند برس قبل ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ جہاں آج کل کسی نجی تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔

درجنوں مشاعروں میں کلام پڑھا چند ایک بار ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے بھی کلام سنا چکے ہیں۔ شاعری میں غالب، اقبال، فیض، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی سے متاثر ہیں۔ ہمہ جہت شخصیات کے مالک ہیں اور اعتدال پسندی ان کا خاصا ہے، زندگی میں معاشی اُتار چڑھاؤ بھی آئے لیکن ہر موقع پر ثابت قدم رہے۔ جہد مسلسل پر یقین رکھتے ہیں الغرض ڈاکٹر صاحب چھوٹے قد و قامت کے ایک بڑے انسان ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

غموں کا ایک سمندر اتر گیا ہوتا　　وہ نام ذہن سے تیرے گذر گیا ہوتا
جھکا ہے ظلم کے آگے تو موت ہے سر کی　　یہ زندہ رہتا اگر دار پہ گیا ہوتا
غریب جاگتے بچوں کو کیسے بہلاتا　　اگر وہ رات سے پہلے ہی گھر گیا ہوتا

قضا نصیب میں کب پھول تھے دوانے کے
برستے سنگ ہی اس پہ جدھر گیا ہوتا

غزل نمبر ۲:

خوشی کے رنگ کا ہم اہتمام کیا کرتے　　جو ہم پہ قرض تھے وہ صبح و شام کیا کرتے
جو اپنی ٹھوکروں میں رکھتا تھا ملازم کو　　ہم ایسے شخص کو جھک کر سلام کیا کرتے
جہاں پہ ہاری زمیندار سب شکاری تھے　　کسی شجر پہ پرندے قیام کیا کرتے

وہی چراغ بجھائے وہی جلائے بھی
ہوا کو روکنے کا انتظام کیا کرتے

☆☆☆

فضل گلشن آبادی

نام محمد افضل خان ہے جب کہ حلقۂ احباب سخن میں فضل گلشن آبادی کے تخلص و نسبت سے شہرت پائی۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ہندوستان کے صوبہ مدھیہ پردیش کے قصبہ جاورہ (گلشن آباد) میں پیدا ہوئے۔ بچپن وہیں گذرا، جوان ہوئے پاکستان ہجرت کی اور ۱۹۴۹ء میں ٹنڈو آدم میں سکونت اختیار کی۔ تقریباً تیس بتیس برس تک یہاں مقیم رہنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں بلدیہ ٹاؤن کراچی منتقل ہو گئے اور جماعت اسلامی کے تحت کام کرنے والے چند ایک تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ چھوٹا موٹا بیوپار بھی کی۔ اولاد میں ایک بیٹا بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا اور ایک بیٹی گھر بار والی اور صاحب اولاد ہے۔ مجموعی طور پر سیلانی طبیعت پائی۔ شکار وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ جب تک یہاں تھے اپنی شکاری بندوق ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ امین الدین علوی مرحوم اور پروفیسر ڈاکٹر عزیز انصاری کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، جب تک یہاں رہے باقاعدگی سے مشاعرے پڑھتے رہے، باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی البتہ ابتداء میں ادیب گلشن آبادی سے مشورۂ سخن فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ علامہ عبدالمجید افضل سے کچھ عرصہ واسطہ رہا۔ نیز غالب، قابل اجمیری اور استاد قمر جلالوی کو بھی پسند کرتے ہیں[1]۔

---

[1] کچھ عرصہ سے موصوف کے بارے میں کوئی اطلاعات نہیں ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

آج پھر وعدۂ فردا ہوگا وعدہ کیا آپ سے ایفاء ہوگا
ہم جنوں میں بھی وہاں پہنچے جہاں کوئی ذی ہوش نہ پہنچا ہوگا
ہم سے ہے دار و رسن کی زینت حق کا ہر دور میں چرچا ہوگا
آج روشن ہیں کچھ ایسے بھی چراغ جن کے بجھنے سے اُجالا ہوگا

فضل کے حال پہ ہنسنے والوں
اپنے انجام پہ رونا ہوگا

غزل نمبر ۲:

متاعِ حسرت و ارمان و آرزو اپنی لٹا کے ہم نے بڑھائی ہے آبرو اپنی
تصورِ رخِ جاناں سے کب ملی فرصت ابھی ہوئی ہے کہاں اُن سے گفتگو اپنی
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی گلستاں کو کلی میں رنگ ہے اپنا نہ گل میں بُو اپنی
انہیں میں ڈھونڈنے نکلا تھا خود کو کھو بیٹھا ملے جو وہ تو ہوئی مجھ کو جستجو اپنی

عجیب وقت گلستاں پہ فضل آیا ہے
بچائیں اہلِ چمن کیسے آبرو اپنی

☆☆☆

فہیم زیدی

نام سیّد سردار حسین زیدی، تخلص فہیم، ۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء میں کھیرتھل، ریاست الور (بھارت) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کھیرتھل اور میٹرک کا امتحان جے پور سے پاس کیا، ایکسچینج بنک افریقہ، پنجاب نیشنل بنک آف انڈیا اور حبیب بنک آف پاکستان سے منسلک رہے۔ نہایت وضع دار شخصیت کے مالک اور پختہ کار شاعر ہیں، غزل کے علاوہ سلام کہنے میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ کچھ عرصہ پہلے حیدرآباد منتقل ہو گئے

نمونۂ کلام

غزل نمبرا:

رنج و راحت کے گھر پالے گئے — پھر غمِ ہستی میں ہم ڈالے گئے
جب بھی ہم عرضِ تمنا لے گئے — وعدۂ فردا ہی پہ ٹالے گئے
اللہ اللہ خاک کی یہ منزلت — اس کے سانچے میں بشر ڈھالے گئے

تم بھی اب رختِ سفر باندھو فہیم
سب تمھارے چاہنے والے گئے

غزل نمبر۲:

عہدِ عمل سے دور پڑا رہ گذر میں ہے — اُلجھا ہوا یہ مسئلہ خیر و بشر میں ہے
انسان کی سرشت میں شر ہے نہ خیر ہے — ہاں اختیار کرنے کی قدرت بشر میں ہے
طولِ شبِ اُمید سے گھبرا اُٹھا ہے دل — اللہ کتنی دیر طلوعِ سحر میں ہے
کس پر یقین کیجیے کس کس کی مانیے — ہر معتبر کا حال ہماری نظر میں ہے

گلشن میں آشیاں تو بنایا ہے اے فہیم
بجلی یہ کہہ رہی ہے کہ میری نظر میں ہے

☆☆☆

کلیم شاہ

۱۰ ردسمبر ۱۹۴۲ء کو ضلع اور ریاست جے پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ٹنڈو آدم ہجرت کی، بی اے تک تعلیم حاصل کی لیکن ملازمت کے بجائے فوٹو اسٹوڈیو قائم کرلیا۔ صحافت کے پیشے سے بھی منسلک رہے۔ ایک دو اخبارات کی طرف سے ٹنڈو آدم میں پریس فوٹو گرافر کے طور پر کام کیا، موسیقی اور شاعری سے اچھا خاصا شغف ہے، مہران آرٹ سرکل نامی ایک مقامی تنظیم کے بانی بھی رہے۔ زیادہ تر ملی نغمات لکھتے ہیں، کسی سے اصلاح نہیں لیتے، بعض نغمات میں ردیف، قافیہ اور وزن کی قید نہیں رکھتے، ان کے نغمات ان کی تنظیم کے پروگراموں میں گائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں "مہک" اور "جذبہ" کے نام سے دو کتابچے شائع کر چکے ہیں جن میں زیادہ تر ان کے اپنے نغمات ہیں۔

نمونہ کلام

نظم:

میرے ساتھی تو چھپا ہے کہاں
تو چھپا ہے کہاں
میرے ساتھی
شام سویرے تجھ کو یاد کروں
میں تجھ کو یاد کروں
ملنا بھی چاہوں پھر بھی دور رہوں
میں تم سے دور رہوں
میرے ساتھی...

آجا میرے ساتھی کیوں مجھ کو تڑپائے
کیوں مجھ کو تڑپائے
پیار کی شمع دل میں جلا کر
تیرا کروں انتظار
میرے ساتھی
میرے ساتھی
میرے ساتھی تو چھپا ہے کہاں
تو چھپا ہے کہاں

☆☆☆

محمد اسماعیل تاباںؔ

محمد اسماعیل نام، تاباں تخلص، ۱۹۵۸ء میں شہداد پور میں پیدا ہوئے، ان کے آباء جے پور (بھارت) سے ہجرت کرکے شہداد پور آئے تھے۔ ایم۔اے (اُردو) اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں، ادب، سیاست، تاریخ اور قانون کے مضامین میں دلچسپی ہے۔ ان مضامین کا خاصا مطالعہ کیا۔ طالب علمی کے دور سے طبیعت شاعری کی طرف مائل ہے۔ ابتداء میں استاد شاعر جوہرؔ شاہجہانپوری سے اصلاح لی، غزل کہتے ہیں البتہ نعت گوئی کی طرف بھی میلان ہے۔ ان کا کلام مقامی اور ملکی اخبارات و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ کالج کے زمانے میں شوق سے مشاعرے پڑھا کرتے تھے۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں، جہاں وکالت کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

کام اک بار بار کون کرے — جیب کو تار تار کون کرے

آپ خوابوں میں بھی نہیں آتے — آپ کا انتظار کون کرے

آپ کھاتے ہیں ہر قسم جھوٹی — آپ پہ اعتبار کون کرے

تاباںؔ غدار ہوں جو گل بوٹے
ذکرِ فصلِ بہار کون کرے

غزل نمبر۲:

آپ کا انتظار تھا نہ رہا — میں بہت بے قرار تھا نہ رہا

پوچھتے کیا ہو گورِ عاشق کا — اک شکستہ مزار تھا نہ رہا

جیب و داماں کا ذکر رہنے دو — پیرہن تارتار تھا نہ رہا

اے خزاں تیرے سبز قدموں سے — گلستاں میں بہار تھا نہ رہا

ہائے تابانیاں وہ تاباںؔ کی
آدمی یادگار تھا نہ رہا

☆☆☆

محمد شریف طالبؔ

۶/جون ۱۹۳۵ء کو "گوٹھ کالے خان" منصورہ (دلور) میں پیدا ہوئے، باپ دادا کا تعلق کھاریاں گجرات سے تھا جو ۱۸۸۲ء میں ہجرت کر کے یہاں منتقل ہو گئے تھے، پیشے کے اعتبار سے کاشت کار تھے۔

طالبؔ نے ایم اے، بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۸۱ء میں لیکچرر مقرر ہوئے، ملازمت کا ایک لمبا عرصہ سندھ کے مختلف اضلاع میں گزارا، آج کل گورنمنٹ ایلیمینٹری کالج آف ایجوکیشن سانگھڑ میں تعینات ہیں، جب کہ مستقل سکونت ٹنڈو آدم میں ہے۔[1]

۱۹۷۳ء سے شعر کہہ رہے ہیں، بیک وقت سندھی، اردو، پنجابی اور سرائیکی میں طبع آزمائی کرتے ہیں، مادری زبان پنجابی ہے۔ مگر زیادہ تر سندھی میں کہتے ہیں۔ اقبالؔ، غالبؔ، شاہ عبداللطیف اور فیضؔ سے متاثر ہیں۔ نعت، غزل اور گیت کے شاعر ہیں۔

۱۔ ۲۸ نومبر ۲۰۰۶ کو انتقال ہو چکا۔

نمونۂ کلام

غزل:

تجھ بن کیسے بیتی رات نیناں برسے بن برسات
میرا آنگن آج بھی سونا نہ کوئی ساتھی نہ کوئی سات
نہ برکھا ہے نہ بادل چھائے کیسی بری یہ برسات
الفت کا دستور نرالا عشق نہ پوچھے کوئی ذات
کیسی دنیا ہے یہ طالبؔ
مانے نہ کوئی میری بات

گیت:

شب بھر مجھ کو نیند نہ آئی
ہر دم تیری یاد ستائی

اٹھ اٹھ دیکھا کوئی نہ پایا سمجھا ہوا کا جھونکا آیا
نہ کوئی اپنا نہ کوئی پرایا کیسی میں نے آس لگائی

چاند بھی ڈوبا ڈوبے تارے عہد و پیاں جھوٹے سارے
تم ہو جیتے ہم ہیں ہارے محبت ہم کو راس نہ آئی

مجھ سے روٹھے میرے سائے طالبؔ دل کو چین نہ آئے
قدم قدم پہ دھوپ جلائے نظر نہ تیری صورت آئی

☆☆☆

محمد عثمان رازؔ فاروقی

محمد عثمان نام اور رازؔ تخلص ہے۔ ۱۹۱۶ء کے لگ بھگ قصبہ اکبر پور ریاست الور (راجپوتانہ، بھارت) میں پیدا ہوئے[۱]، پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اُردو کے علاوہ فارسی، ہندی اور انگریزی پر دسترس حاصل ہے، آرمی میں بحیثیت صوبیدار فرائض انجام دیے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ٹنڈو آدم میں مقیم ہیں۔ آج کل اپنی زرعی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں[۲]۔ آسودہ حال ہیں، تمام بیٹے بیٹیاں تعلیم یافتہ ہیں۔

شعر گوئی کا شوق طالب علمی کے زمانے سے ہے۔ محمد ایوب قمرؔ جے پوری کے تلامذہ میں سے ہیں، ٹنڈو آدم میں سفیرؔ، دردؔ، وفاؔ، عزیزؔ اور اخترؔ ماہری کے ساتھ نشست و برخاست رہتی تھی۔ غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، طنز و مزاح میں بھی اچھا کہتے ہیں۔

۱۔ ۹۶ میں اپنی عمر ۸۰ سال بتاتے تھے۔ ۲۔ ۹۸۔۱۹۹۷ میں خاندان کے ہمراہ کراچی منتقل ہو گئے تھے، وہیں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام

قطعہ

ہیں وٹامن کا خزانہ سبزیاں
آدمی کو گھاس چرنا چاہیے
کتنا پیارا ناچتی ہیں بیگمات
رنڈیوں کو ڈوب مرنا چاہیے

غزل نمبر ۱:

ہوئے جو مجھ پہ عیاں میری ذات کے پہلو　　　سمجھ میں آنے لگے کائنات کے پہلو
عمل کے وقت نشہ میں تھا پیرِ مے خانہ　　　اگرچہ اور بھی شاید ہوں مات کے پہلو
میں تیرے رنگ میں رنگ بھی جاؤں گا لیکن　　　سمجھ تو لوں میں تری خواہشات کے پہلو

کچھ اور وقت لگے گا انھیں سمجھنے میں
نئے نئے ہیں ابھی تجربات کے پہلو

غزل نمبر ۲:

پھر سے تشکیلِ جہاں کر　　　اس زمیں کو آسماں کر
مسکراہٹ کی تہوں میں　　　زخم ہائے دل نہاں کر
پھر لطفِ حسنِ عالم　　　آرزوؤں کو جواں کر
بحر و بر تکتے ہیں مجھ کو　　　عزمِ تسخیرِ جہاں کر

رازؔ میدانِ عمل میں
جوہرِ ذاتی عیاں کر

☆☆☆

محمد عمران صدیقی ساغرؔ

نام محمد عمران صدیقی، تخلص ساغرؔ، ۱۹۵۳ء میں کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے[1]۔ بھارت سے ہجرت کرنے کے بعد جھول ضلع سانگھڑ میں مستقل سکونت اختیار کی، زرعی معاشیات میں M.Sc کرنے کے بعد سانگھڑ میں اسسٹنٹ ایکشن کمشنر مقرر ہوئے۔ حکیم شفیق الرحمٰن شفاؔ کاندھلوی مرحوم رشتے میں نانا اور شعر و سخن میں استاد تھے۔ ساغرؔ صدیقی نے ۱۹۷۷ء میں اپنے نانا کے مشورے سے "انجمن فروغِ ادب" کی بنیاد رکھی اور اس تنظیم کے تحت کئی مشاعرے بھی منعقد کرائے۔ غزل اور نظم خوب کہتے ہیں، آج کل ملازمت کے سلسلے میں ضلع سے باہر ہیں۔

---

[1] ۱۹۸۵ء میں موصوف نے انجمن فروغِ ادب سانگھڑ کے تحت ایک ادبی مجلہ بہ عنوان "عکس" شائع کیا تھا جس میں "اپنی کہانی اپنی زبانی" کے عنوان سے مضمون میں اپنی عمر ۳۲ سال لکھی تھی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

تجھے چاہوں تجھے دل میں بسالوں — تجھے منزل تجھے مقصد بنا لوں
ترستی ہے جبیں قدموں کو تیرے — تجھے سجدے کروں کعبہ بنا لوں
حیاتِ ظاہری فانی ہی ٹھہری — میں جامِ جم تو ساقی سے منگا لوں
مری تر دامنی سے درگزر کر — تری عفت کو میں ایماں بنا لوں

یہی ہے آرزوئے شوق ساغرؔ
کہ ہو کر شمع پہ قرباں جلا لوں

غزل نمبر ۲:

مزیّن وفا سے تمہیں جان کر — بٹھایا ہے دل میں خدا مان کر
ہوئے سر بہ سجدہ فرشتے سبھی — محبت کی عظمت کو پہچان کر
مجھے وعظ کی شیخ حاجت نہیں — ذرا تند خو کو مسلمان کر
کرم ہے جفا کا یہ ثمرہ ملا — "بڑا دکھ ہوا تم کو پہچان کر"

نہ دیر و حرم کی رہی جستجو
قریب از رگِ جاں تجھے جان کر

☆☆☆

محمد علی شہابؔ

سید محمد علی المتخلص بہ شہابؔ ۶ر فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کی والدہ کا عارضی قیام تھا، ان کے بزرگ تقسیم ہند کے فوراً بعد شہداد پور میں آ کر مستقل آباد ہو گئے تھے، مڈل تک تعلیم حاصل کی، بعد ازاں چائلڈ کیئر ورکر کا کورس کیا اور اسی ادارے سے منسلک ہو گئے اس طرح مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے، البتہ اپنی ذہانت کے باعث اُردو کے علاوہ سندھی، پنجابی اور انگریزی کا اچھا خاصا درک رکھتے ہیں۔ ان دنوں کھپرو (سانگھڑ) میں اسسٹنٹ سوشل ویلفیئر آفیسر کے طور پر تعینات ہیں۔ مستقل رہائش شہداد پور میں ہے۱۔

شاعری کا شوق بچپن میں اُس وقت ہوا جب اپنے والد۲ کے ساتھ ”بزمِ ادب شہداد پور“ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، کم سنی میں شعر کہنے لگے۔ ۲ر اپریل ۱۹۶۴ء کو گیارہ سال کی عمر میں پہلا مشاعرہ پڑھا، طبیعت موزوں پائی ہے چنانچہ اس فن میں خاطر خواہ کامیابی ملی۔ مولانا محمد اسماعیل صادقؔ مرحوم سے شرفِ تلمذ ہوا اُن ہی کی طرح بعض اوقات مشکل بحروں میں شعر کہتے ہیں اور اشعار میں مشکل الفاظ کو سلیقے سے استعمال میں لاتے ہیں۔ شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی البتہ غزل اور نعت کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ بزمِ ادب شہداد پور کے سرگرم کارکن ہیں، مقامی مشاعروں کے علاوہ ریڈیو پاکستان کے چند ایک مشاعرے بھی پڑھے، اب تک سینکڑوں غزلیں، نظمیں کہہ چکے ہیں، لیکن اپنی درویشانہ طبیعت کے سبب جمع نہیں کر سکے، نام و نمود اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں بہت سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی

---

۱ چند برس قبل موصوف نے شہداد پور میں وفات پائی۔
۲ ان کے والد سید احمد علی خود شاعر نہیں تھے البتہ ادب نواز شخصیت تھے۔ ”بزمِ ادب شہداد پور“ کے فعال سیکریٹری رہے۔

سادگی کے سبب احباب کا خیال ہے کہ ان کا دماغی توازن درست نہیں لیکن راقم الحروف نے جو وقت اُن کے ساتھ گذارا اس میں نہ صرف انھوں نے ضلع سانگھڑ کی ادبی صورت حال پر حقیقت پسندانہ بحث کی بل کہ مجھے چند ایک بزرگ شعراء سے ملوایا اور "بزم ادب شہداد پور" کے کتب خانے کا تفصیلی دورہ بھی کرایا۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ ادب پر ان کی معلومات اچھی خاصی ہیں، موصوف کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ کئی شعراء کے اشعار زبانی یاد ہیں۔

اشعار کہنے اور الفاظ کو حسین ولطیف انداز میں نظم کرنے میں انھیں قدرت حاصل ہے، وہ جہاں انتہائی مشکل الفاظ کا استعمال جانتے ہیں وہاں اس بات پر بھی قادر ہیں کہ سلاست اور روانی کا لطف کس طرح سامعین تک پہنچایا جاسکے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ا:

بچھ کر آئے ہیں ابھی جینے کے انداز کہاں
قتل پر ہے مرے آمادہ جفاساز کہاں

ہے کہاں چاند میں تابانی رخسار تری
مسکراہٹ کا تری غنچوں میں انداز کہاں

دیکھ لینا انھیں کچھ اور جواں ہونے دو
صرف شوخی ہے ابھی غمزہ کہاں ناز کہاں

چاک دامانیٔ گل کا اُسے احساس بھی ہے
سیر گلشن کو چلی ہے وہ بصد ناز کہاں

روز و شب جس کی جدائی میں تڑپتا ہوں شہابؔ
میرا ہم راز کہاں ہے مرا غم ساز کہاں

غزل نمبر ۲:

خطِ مصحف رُخ پہ ہیں یوں تفسیر کے پہلو
احد احمد میں جیسے میم کی تحریر کے پہلو

کٹاری کے، چھری کے، بانک کے، شمشیر کے پہلو
"دو عالم سے نرالے ہیں تری تصویر کے پہلو"

نہ جاؤ طور پر موسیٰ یہاں آؤ کہ ہم تم کو
دکھائیں صانع صنعت کی عالم گیر کے پہلو

وہ ہرجائی لباسِ ہر بشر میں یوں نظر آیا
کہ جیسے زرد بھنوں میں گلِ کشمیر کے پہلو

تمھارے عشق میں جو دل کی حالت ہے کہوں کیسے
جو دردِ دل سے واقف ہیں وہ دیکھیں تیر کے پہلو

☆☆☆

محمد علی مضطر

راجپوت گھرانے سے تعلق ہے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد شوگر ملز میں ملازم ہو گئے۔ سندھ و پنجاب کی کئی ملز میں فرائض انجام دیے۔ ماضی میں شہداد پور ہاکی ٹیم کے بہترین کھلاڑی تھے۔ شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں مطالعے کے شوقین ہیں، ادب میں معلومات وسیع ہیں، اردو سمیت کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ نظم و نثر میں یکساں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ شخصیات کے خاکے بھی خوب لکھتے ہیں۔ ابتداء میں پروفیسر نعیم حیدر تقوی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے، اُن کی وفات کے بعد فاضل حمیدی سے رجوع ہو گئے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

وجہِ سکوں بنے تو ہوئے بے قرار ہم — انسانیت کے نام پہ کرتے ہیں پیار ہم
مانا قدم قدم پہ ہیں کانٹے بچھے ہوئے — ٹھیرے ہیں ایک پل نہ سرِ رہگذار ہم
دہکا دیا ہے لالۂ صحرا کو دھوپ نے — کس کو دکھائیں جا کے دلِ داغدار ہم
نکلے تھے ڈھونڈنے انھیں لیکن یہ حال ہے — کرنے لگے ہیں اپنا ہی اب انتظار ہم

غم مسکرا کے کہتے ہیں انداز ہے جدا
مضطرؔ دکھی دلوں کی ہیں اِک پکار ہم

غزل نمبر۲:

ہنسی تو تھی سرِ محفل سبھی کے ہونٹوں پہ — مگر تھی خاص ادا اُن کے مسکرانے کی
خلوص و مہر و وفا کا نہ ذکر کر ہمدم — نوازشیں ہیں بہت ہم پہ بھی زمانے کی
چمن میں کس نے کیا ذکر گل سے گلچیں کا — کہ اشک بہہ گئے کوشش میں مسکرانے کی

ملا ہے اور کیا مضطرؔ سوائے اشکوں کے
جو یاد آئی بھی بیتے ہوئے زمانے کی

☆☆☆

مسرور احمد مسرورؔ

ٹنڈو آدم کے کہنہ مشق استاد شاعر مسعود احمد عزیزؔ مرحوم کے صاحب زادے مسرور احمد مسرورؔ ۲۹ رجولائی ۱۹۶۹ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے، نیو علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم سے گریجویشن کیا، آج کل کراچی میں چارٹرڈ اکاؤنٹس کا کورس کر رہے ہیں، اسی سبب سے وہاں عارضی قیام ہے[1]۔

بچپن میں اپنے والد صاحب کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں سے شعر فہمی کا شوق پیدا ہوا جو بعد میں شعر گوئی میں تبدیل ہوگیا، میٹرک کے دور سے شعر کہتے آرہے ہیں، ابتداء میں والد صاحب سے اصلاح لیتے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد سے کسی کو زحمتِ اصلاح نہیں دی۔ غالبؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور اپنے والد صاحب کی شاعری سے متاثر ہیں۔ غالبؔ کے تو حد درجہ مداح ہیں۔

شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور مزاح نگاری میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں، موصوف کے پڑھنے کا انداز بہت ہی پیارا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت شاعر نام پیدا کرنے میں انھیں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

---

۱ شادی کے بعد سے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

ہے شب ہجر کا ہر سمت اندھیرا لوگو ہائے یہ رات نہیں جس کا سویرا لوگو

کیسے سمجھاؤں میں تم کو کہ نہیں ہوتا ہے صرف سورج کے نکلنے سے سویرا لوگو

تھے مرے خون سے روشن کبھی بستی کے چراغ اور رہا میرے ہی آنگن میں اندھیرا لوگو

کبھی یہ شخص بھی مسرورؔ تھا اوروں کی طرح
جس کی آنکھوں میں ہے ویرانی کا ڈیرا لوگو

غزل نمبر ۲:

یوں لگا جیسے کہ چمن مہکا جب بھی جانم ترا بدن مہکا

میرے اشکوں سے بھیگ کر کیسا تیرا آنچل اے جانِ من مہکا

زخم سے نکلا جو عرق میت پہ کس قدر پھر مرا کفن مہکا

جب کہ وہ باغ میں گئے ہی نہیں
کیسے مسرورؔ پھر چمن مہکا

☆☆☆

مطلوب حسین محرم

سید مطلوب حسین نقوی المتخلص بہ محرمؔ۔ غالباً ۱۹۴۰ء میں قصبہ سنگھانہ، ریاست جے پور (بھارت) میں پیدا ہوئے[1]۔ تشکیلِ پاکستان کے فوراً بعد ٹنڈو آدم آ گئے۔ ۱۹۶۳ء میں فارسی میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۳ء میں کراچی میں شادی ہوئی، چنانچہ عارضی طور پر وہاں منتقل ہو گئے، جہاں شاہ فیصل اسکول کی بنیاد رکھی، کچھ عرصہ معلمی کے فرائض بھی انجام دیے لیکن گھریلو ناچاقیوں اور اپنی زوجہ کے ساتھ ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب ۱۹۶۹ء میں دونوں کے درمیان علیحدگی ہوگئی جس کے بعد دوبارہ ٹنڈو آدم آ کر مستقل سکونت اختیار کرلی، اولاد میں ایک بیٹا تھا جو علیحدگی سے کچھ عرصہ پہلے انتقال کر گیا تھا، کچھ عرصہ یہاں طلبہ کو ٹیوشن پڑھاتے رہے، آج کل بیڑی بناتے ہیں، زندگی تنگ دستی اور مالی پریشانیوں میں گذر رہی ہے[2]۔

۱۹۶۰ء میں ٹنڈو آدم میں منعقد ہونے والے پاک و ہند مشاعرے کو سننے کے بعد ذوقِ شعر گوئی پیدا ہوا۔ غزل کہنے لگے، ابتداء میں تخلص زخمیؔ فرماتے تھے لیکن بعد میں محرمؔ ہو گئے۔ درد سعیدی اور سفیر گلشن آبادی سے اصلاح لی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری و ناول نگاری کا ذوق بھی رہا، بہت پہلے "ضبطِ محبت" اور "برسات کی رات" کے عنوانات سے دو ناول لکھے جو ان کے بقول مالی پریشانیوں کی نذر ہو گئے۔

---

[1] بقول ان کے شادی اور پھر جلدی علاحدگی کے سبب تمام ضروری دستاویز ہاتھ سے جاتی رہیں چنانچہ سنِ پیدائش معلوم نہیں۔ [2] چند سال پہلے ٹنڈو آدم میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

قلب و نظر میں وسعتیں پیدا کریں گے ہم — زیرِ نقاب بھی اُسے دیکھا کریں گے ہم
جب آئے گا خیالِ گلستاں آرزو — صیاد سے نہ کوئی تقاضا کریں گے ہم

دنیائے رنگ و بو ہی میں بس ہوئی
"سوچا ہے اپنی آپ تمنا کریں گے ہم"

غزل نمبر۲:

فضائے صحنِ گلستاں کو سوگوار نہ کر — خزاں کا ذکر خدارا تو بار بار نہ کر
نہیں ہے بوئے وفا اس چمن کے پھولوں میں — تو اپنے دامنِ ہستی کو تار تار نہ کر
ہر ایک جذبہ تحیر پذیر ہوتا ہے — کسی کے وعدۂ فردا کا اعتبار نہ کر
خیالِ مرگ ہر اک موڑ پر ستائے گا — وفا کی راہ میں اب زندگی سے پیار نہ کر

متاعِ صحنِ گلستاں تو لٹ گئی محرم
گلوں کی چاہ میں اب خود کو بے قرار نہ کر

☆☆☆

مطلوب طالبؔ

پیدائشی نام محمد مطلوب، تخلص طالبؔ ہے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے، بی ایڈ اور بی یو ایم ایس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۷۳ء سے درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں، ان دنوں مولانا محمد علی جوہر میونسپل ہائی اسکول ٹنڈو آدم میں تعینات ہیں، علاوہ ازیں "حارث کلینک" کے نام سے ذاتی مطب ہے جہاں شام کے اوقات میں بیٹھتے ہیں[1]۔

اگرچہ معاشی طور پر زندگی مناسب و مطمئن بسر ہو رہی ہے مگر آلام و مصائب سے بھی پرانی نسبت ہے اس کے باوجود طبعاً نفس مکھ، شوخ اور فراخ دل ہیں، ان ہی کی شفقت، رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے راقم الحروف میں لکھنے لکھانے کی تحریک پیدا کی[2]۔

۱۹۷۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں، شاعری کسی سے متاثر ہوئے بغیر شروع کی، البتہ حالات زمانہ اور گردش ایام نے طبیعت کو اس طرف ضرور مائل کیا، مسعود احمد عزیزؔ اور وفا عزیزی مرحومین سے اصلاح لی[3] جب کہ اقبالؔ، فرازؔ اور بشیر بدرؔ کے کلام سے خاصے متاثر ہیں۔ مجموعی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی

---

[1] دورانِ ملازمت، یرقان کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد چند برس قبل کراچی میں انتقال ہوا، وہیں تدفین عمل میں آئی۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل فیملی کراچی منتقل کر چکے تھے۔

[2] موصوف جوہر ہائی اسکول میں تین سال تک میرے کلاس ٹیچر رہے، وہ ایک قابل اور فعال ٹیچر تھے، اسکول کی دس سالہ تقریبات کا انعقاد اور سالانہ مجلّہ کی اشاعت میں ان کا اہم کردار تھا، علاوہ ازیں ماہ نامہ آئینۂ جوہر کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی شائع کرتے تھے۔

[3] موصوف کلام پر، اپنے احباب ارشد جالندھری، اختر عادل اور جمیل خاور سے بھی مشورہ لیتے تھے۔

نعت، حمد، سہرا اور نظم میں بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔ اشعار میں سوز و گداز اور تحریر میں روانی و سلاست پائی جاتی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار اور مقرر بھی ہیں، ان کی تحریریں اور کلام کراچی و حیدرآباد کے رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

شعور و عزم کی قسمت بنا رہے ہیں ہم
جہاں میں عظمتِ انساں بڑھا رہے ہیں ہم

ہر ایک ذرے کو بخشی ضیاءِ مہرِ خودی
ہر ایک قطرے کو طوفاں بنا رہے ہیں ہم

نہ آنے دیں گے کبھی آنچ ملک و ملت پر
جواں ارادوں کی دنیا بسا رہے ہیں ہم

حوادثات کی صرصر ہو تیز کتنی مگر
نہ بجھ سکیں گے دیے وہ جلا رہے ہیں ہم

وقارِ ملک میں خود کو مٹا کر اے طالبؔ
سراغِ منزلِ مقصود پا رہے ہیں ہم

غزل نمبر ۲:

تخیل کے بادصف ادھورا سا لگے ہے
تو ہو کے کسی اور کا اپنا سا لگے ہے

لب بھی وہی، رخسار بھی، خوشبو بھی وہی ہے
ہر پھول کا چہرہ ترا چہرہ سا لگے ہے

احساس میں سمٹا ہوا شیشے کا بدن ہے
چھو لوں تو بکھر جانے کا دھڑکا سا لگے ہے

اک میں ہی نہیں کربِ جدائی میں گرفتار
وہ کھو کے مجھے خود بھی اکیلا سا لگے ہے

ویرانے ترے قرب میں تھے شہر کی مانند
اب تیرے بنا شہر بھی سونا سا لگے ہے

وہ تشنہ لبی ہے کہ پی کے زہر بھی طالبؔ
ان ہونٹوں کی حسرت میں ابھی پیاسا لگے ہے

☆☆☆

مظفرؔ ادیب

سابق معلم ہیں، آج کل ٹنڈو آدم میں ہومیو پیتھک کلینک پر بیٹھتے ہیں، ضعیف العمر ہیں، دردؔ سعیدی، جوہرؔ سعیدی، قمرؔ ہاشمی اور وفاؔ عزیزی کی صحبت نے ان کے شعری ذوق کو جلا بخشی، لیکن دردؔ، قمرؔ اور وفاؔ کی دائمی جدائی اور جوہرؔ کے کراچی منتقل ہو جانے کے بعد انھوں نے شعر کہنا انتہائی کم کر دیا۔ اب پہلے ایسا جوش و ولولہ نہیں رہا، کبھی کبھار ٹنڈو آدم کے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی کوئی پرانی غزل پڑھ دیتے ہیں[۱]۔ مطالعہ خوب ہے، قدیم و جدید ادب پر گہری نظر ہے تل کہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موصوف شعر و ادب کا ایک خزانہ اپنے سینے میں محفوظ رکھتے ہیں۔

راقم الحروف نے موصوف سے ان کے کوائف جاننے کے لیے بیسیوں ملاقاتیں کیں، لیکن ہر بار آئندہ پہ ٹالا گیا، اس طرح مقالہ جمع کرانے کی تاریخ آن پہنچی تازہ کلام کے لیے بھی بڑی کوششیں کی گئیں لیکن بارآور ثابت نہ ہو سکیں، لہٰذا مجبوراً موصوف کی دو پرانی غزلیں ہی بطور نمونہ کلام پیش کی جاتی ہیں۔

---

[۱] ۱۹ فروری ۲۰۰۱ء کو عازمِ ملکِ عدم ہوئے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

ہر نظر جلوے سراب آسا ہوئے	تشنگی میں ریت کا دریا ہوئے
زیست کے صحرا میں ترے چھاؤں کو	دھوپ کی مانند ہم تنہا ہوئے
صورتِ آئینہ خود سے بے خبر	ہم ہی اپنی ذات کا پردا ہوئے

ہیں گریزاں لوگ ہم سے یوں ادیبؔ
راستے کا جیسے ہم کانٹا ہوئے

غزل نمبر۲:

ہر گام رہِ فکر و نظر پہ یہ رقم ہے	صدیوں کی مسافت کا صلہ لغزشِ قدم ہے
اب دامِ خرد میں بھی دیوانوں کو غم ہے	گیتوں کی صدا نغمۂ زنجیر سے کم ہے
پروازِ تخیل سے مرا تیز قدم ہے	اب دیدنی درماندگیِ دیر و حرم ہے
مجبور پرستش بھی ہوں مختارِ پرستش	تقدیر کے بت خانے میں تقدیرِ صنم ہے
ہے کتنا سکوں یاس کی آغوش میں مجھ کو	عشرت تو میسر ہوئی تو عشرتِ غم ہے

ہے یہ بھی ادیبؔ ایک صلہ بت شکنی کا
اب میری گزرگاہ کا ہر سنگ صنم ہے

☆☆☆

ندیم احمد ندیم کشمیری (انعام ندیم[1])

انعام اللہ المعروف ندیم احمد ندیم۔ ۲۰ راپریل ۱۹۶۷ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئے، معاشیات میں ایم اے کیا، آج کل ایم۔اے اُردو کے سال آخر میں ہیں[2]۔ شعروادب کا شوق زمانۂ طالب علمی سے ہے۔ ابتداء میں کچھ عرصہ تک پروفیسر ڈاکٹر فدا حسین انصاری صاحب سے اصلاح لی، علاوہ ازیں قدیم وجدید شعراء کے کلام سے استفادہ کیا۔ میرؔ، غالبؔ، میراجیؔ، ن۔م۔راشد، فیضؔ اور منیر نیازی سے متاثر ہیں۔ موسیقی اور مصوری سے بھی خاصا شغف ہے، موسیقی سے متعلق اخبارات میں چند ایک مضامین بھی لکھے۔ افسانہ نگاری کی طرف بھی رجوع ہوئے لیکن زیادہ توجہ غزل پر رہی۔ ادبی تنظیم نیشنل رائٹرز فورم شہداد پور کے سیکریٹری اور مجلّہ 'کنول' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ موصوف فنِ مصوری اور فنِ شاعری میں یکساں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں ان کا نام بحیثیت شاعر لیا جائے گا یا بحیثیت مصور[3]۔

---

[1] بعد ازاں "انعام ندیم" کہلانے لگے۔

[2] ۱۹۹۷ء میں ایم۔اے اردو کرنے کے بعد ۲۰۰۰ء میں لیکچرر ہو گئے۔

[3] اوّلین مجموعہ کلام "درِ خواب" ۲۰۰۳ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر۱:

ہر ایک خواب کو بے اعتبار کرتا ہے ۔۔۔ کہ اب یہ آگ کا دریا بھی پار کرتا ہے
شمار کرنے ہیں لمحے تمہاری یادوں کے ۔۔۔ اور اس کے بعد انہیں بے شمار کرتا ہے
کوئی چراغ جلا کر دلِ فسردہ میں ۔۔۔ کسی بھی شام ترا انتظار کرتا ہے
خود اپنی آگ سے کوئی شرار لاتا ہے ۔۔۔ خود اپنی خاک سے مجھ کو غبار کرتا ہے

ندیمؔ خواب سے ٹوٹا ہے خواب کا رشتہ
یہ ربط مجھ کو ابھی استوار کرتا ہے

غزل نمبر۲:

خزاں رُتوں میں سواد بہار جیسا ہے ۔۔۔ وہ شخص مجھ کو کسی اعتبار جیسا ہے
ہر ایک یاد کسی گہری دھند جیسی ہے ۔۔۔ ہر ایک خواب اب اُڑتے غبار جیسا ہے
ترے قریب ہوں لیکن ترے قریب نہیں ۔۔۔ ترا وصال ترے انتظار جیسا ہے
ہر ایک بار نئے منظروں سے آتا ہے ۔۔۔ وہ اِک خیال جو مجھ کو شمار جیسا ہے

تو کہہ رہا ہے، پلٹ جاؤں، لیکن اس دل پہ
میں جانتا ہوں برا اختیار جیسا ہے

☆☆☆

نسیم تقوی

پروفیسر نعیم حیدر تقوی مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اُن ہی کے ہمراہ شہداد پور آئے، بعد میں مقامی کالج میں استاد بھی رہے۔ شعر و سخن کا شوق بھائی سے متاثر ہو کر ہوا، اُن ہی سے اصلاحِ سخن فرمائی۔ شہداد پور کی ادبی تاریخ ان کے نام کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی، کیوں کہ ان کے دم سے شہداد پور میں کئی محافلِ شعر و سخن منعقد ہوئیں علاوہ ازیں ان کی ذاتی کوششوں سے چند ایک ادبی کتابچے بھی منظرِ عام پر آئے جن میں سے ایک "معیارِ سخن" بھی شامل ہے۔ جس میں یہاں کے سندھی اُردو شعراء کا تذکرہ اور کلام شامل ہے۔

موصوف جب تک یہاں رہے اپنے بڑے بھائی کی طرح اُردو سندھی اتحاد اور تعاون پر زور دیتے رہے۔ پھر کراچی میں روزنامہ "نوائے وقت" سے منسلک ہو گئے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

سایۂ زُلف بھی ہے شعلۂ رُخسار بھی ہے
اِس جہانِ ستم ایجاد میں اک دار بھی ہے

کتنے ہی رنگوں میں بکھرا ہے تجھے کیا سمجھوں
تو کہ شعلہ بھی ہے شبنم بھی ہے گلزار بھی ہے

میں نے مفلس کو بھی سینہ سے لگا کر چوما
وہ بھکاری ہے تو کیا وقت کا شہکار بھی ہے

وقت کے پھیلتے لمحوں نہ سمیٹو مجھ کو
مجھ سے وابستہ مہکتا ہوا گلزار بھی ہے

غزل نمبر ۲:

فشارِ جاں کا ستندر حباب کی صورت
قرارِ جاں کا تصور سراب کی صورت

حکایتِ غمِ دوراں رقم ہے چہرے پہ
کہ حرف حرف لکھا ہے کتاب کی صورت

یہ موسموں کی حسین رُت یہ میری تنہائی
یہ رت لگے مرے مجھ پہ عذاب کی صورت

وہ جسم و جاں کی امنگ جو مجھے اماں دیتی
نگاہ و دل کے جزیروں میں خواب کی صورت

☆☆☆

نگہت زیبا

۲۶ر جولائی ۱۹۵۹ء میں شہداد پور میں پیدا ہوئیں، اُردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت کرلی، آج کل گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج ٹنڈو آدم میں اُردو کی لیکچرار ہیں[1]۔

شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا، اُستاد شاعر بیدارؔ رام پوری کی صاحبزادی ہیں۔ میٹرک میں تھیں کہ بیت بازی کے ایک مقابلے میں اچانک کئی اشعار موزوں ہو گئے، علاوہ ازیں شاعری کے محرکات میں حساس طبیعت کا کمال بھی شامل ہے، ابتداء میں والد سے اصلاح لیتی تھیں لیکن ان کی وفات کے بعد رئیسؔ امروہوی، اخترؔ لکھنوی اور فداؔ انصاری سے رجوع ہوئیں۔ علاوہ ازیں غالبؔ، اقبالؔ، پروین شاکر، دردؔ، حالیؔ اور فیضؔ کو پڑھا اور اُن کے دواوین کے مطالعے سے فیض یاب ہوئیں۔

اپنے والد محترم کی دائمی جدائی کے بعد ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا، سایہ پدری سے محرومی زندگی کا ایسا المیہ تھا جس نے سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا، زندگی کی کڑی آزمائشوں کا مقابلہ کیا، ان تمام حالات کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا، کلام میں غم واندوہ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر غزل کہتی ہیں تاہم نعت، حمد، منقبت اور سلام کے ساتھ ساتھ نثر میں افسانے اور مضامین بھی لکھے۔ ان کی تخلیقات مختلف جرائد و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں[2]۔ علاوہ ازیں اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتی ہیں۔

---

[1] ان دنوں گورنمنٹ گرلز کالج ہالا کی پرنسپل ہیں۔　　[2] اوّلین مجموعہ کلام "دھوپ کے پار" ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

دھوپ کی تمازت میں سائبان شیشے کا ‏ پتھروں کی بستی میں ہے مکان شیشے کا
گردشیں زمانے کی رکھتی ہیں پریشاں دل ‏ آندھیوں کی زد میں ہے یہ مکان شیشے کا
بحرِ غم میں دیکھو تو کیا عجیب ہے منظر ‏ کشتیاں ہیں کاغذ کی بادبان شیشے کا

کر ہی لیں تبسم آخر انگلیاں فگار اپنی
سر پہ کیوں اٹھایا تھا آسمان شیشے کا

غزل نمبر۲:

کس کا الم سے ٹوٹ گیا قلبِ نیم جاں ‏ تاریک شب میں چرخ پہ بکھری ہیں کرچیاں
افسردہ آسمان پہ زخمی سی روشنی ‏ ظاہر کرے ہے دہر کی نا مہربانیاں
عنواں بنا ہے چاند ستاروں کے لفظ ہیں ‏ گویا کسی غریب کی لکھی ہے داستاں
چھایا ہوا مہیب اندھیرا ہے ہر طرف ‏ لیکن چمک رہی ہے ستاروں کی کہکشاں

تبسم رہی بجھنے سے قاصر تمام شب
تاروں کی زندگی کو کرے کس طرح بیاں

☆☆☆

نور محمد نور

یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئے، انٹر تک تعلیم حاصل کی، گھریلو ذمہ داریوں کے سبب مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے، آج کل اپنے والد صاحب کے قائم کردہ ہوٹل (قہوہ خانہ) کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

۱۹۶۹ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا، بیدار رام پوری کی تحریک اور اصلاح نے ادب کی راہوں پر گامزن کر دیا تھا، کچھ عرصے تک خوب کہتے رہے لیکن آج کل غم روزگار نے شاعری سے دور کر دیا۔ فیض کو آج بھی پسند کرتے ہیں۔

نمونہ کلام

جب زمانے نے ادا پائی ستم ڈھانے کی
ہم کو اس شغل میں عادت ہے مزا پانے کی

وہ بس مرگ یہ کہتے ہیں، تمنا کیا ہے؟
ہے یہ روداد مرے عشق کے افسانے کی

اے مرے رات کے نالو، مری دن کی آہو
آبرو رکھنا مرے درد میں تڑپانے کی

زخم دل، آبلہ پا، چاک گریباں، نالے
اور کیا شکل ہو دل دار کے گھر جانے کی

کس طرح نورؔ کریں سوزِ محبت کا بیاں
شمع کے روبرو حالت ہے جو پروانے کی

☆☆☆

یعقوب تارخ قرولوی

محمد یعقوب نام، تارخ تخلص، اصل وطن قرولی (بھارت) تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آ گئے، جہاں تقریباً ۲۵ برس تک مقیم رہنے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے، آج کل لانڈھی کراچی میں قیام ہے۔ کبھی کبھار ٹنڈو آدم آ جاتے ہیں، زیادہ تر رشتے دار اور عزیز و اقارب یہیں ہیں۔

والد کا انتقال ان کے بچپنے ہی میں ہو گیا تھا۔ اس صدمے کو انھوں نے زبردستی خود پر طاری کر لیا، طبیعت حساس پائی ہے، سوز و نیت بھی فطری طور پر موجود ہے، ان تمام باتوں نے چھوٹی عمر ہی میں شعر کہنے پر

مجبور کر دیا، ابتداء میں مسعود احمد عزیز سے اصلاح لینے لگے لیکن جلد ہی انھیں اس بات کا احساس دلا دیا گیا کہ ان کے کلام میں اب اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔ شاعری کی تمام ہی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غزل، نعت، حمد، نظم، مرثیہ اور سہرا کہنے میں جواب نہیں۔ غزل میں عام شعراء کی طرح روایتی حسن وعشق اور ہجر وفراق کو موضوع نہیں بناتے بل کہ دورِ حاضر میں گھٹتی بڑھتی انسانی اقدار، ظلم وجبر، ناانصافی، زیادتی اور دیگر سماجی ومعاشرتی برائیوں کی حسین استعاروں میں نشان دہی کرتے ہیں۔

معاشی طور پر حالات سازگار نہیں رہے، پوری زندگی محنت مشقت میں بسر ہوئی۔ ابتداء میں یہاں پرائمری معلم کے طور پر کچھ عرصہ خدمات انجام دیں، صحافت سے منسلک ہو گئے، کراچی میں روزنامہ "جنگ"، "حریت" اور "قومی اخبار" میں ملازمت کی۔ قبل ازیں انگلش ادب میں ایم۔اے کیا۔ ماہنامہ "سسپنس" اور "مسٹری میگزین" میں انگریزی افسانوں اور ناولوں کا اُردو ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔

ٹنڈو آدم میں اپنے دور میں انھوں نے شعر وادب کو فروغ دینے کے لیے "ادارہ فکر ونظر" کے پلیٹ فارم سے بہت کام کیا، اب یہ تنظیم تو باقی نہیں مگر اس کے زیرِ اہتمام کیے گئے علمی، ا۔ ورمذہبی کاموں کی گونج اب بھی سنائی دیتی ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ا:

مصلحت کہتی ہے سوچوں میں اندھیرا کر لو
دستِ امکاں میں اگر چاند نہ آیا جائے

مجھ میں اس دور کے انساں کی کوئی بات نہیں
میرے معبود مجھے پھر سے بنایا جائے

آدمی ہو کے بھی پڑھ لیتا ہوں لوحِ محفوظ
مجھ پہ تقدیر کی مٹی کو گرایا جائے

بڑھ کے سینے سے لگا لو کہ عبادت ٹھہرے
دل اگر ٹوٹا ہوا راہ میں پایا جائے

جھوٹ پھر جھوٹ ہے بولو تو تعفن پھیلے
جھوٹ کے چہرے پہ گو سچ ہی سجایا جائے

بھیڑیے ملتے ہیں انساں کا لبادہ اوڑھے
پردہ چہروں سے اگر ان کے ہٹایا جائے

غزل نمبر ۲:

نہ جانے کیوں مری ہر شخص نے برائی کی　　اگرچہ آس نہ رکھی کبھی بھلائی کی

وہ خواب دیکھے ہیں ہر لمحہ جاگتی آنکھوں　　ہر ایک موئے بدن دے صدا دہائی کی

جلا وجود کا جنگل تو راکھ تک نہ ملی　　عجیب کتنی ہے دنیا بھی پارسائی کی

ہر اک نے اپنی خطا میرے نام پر لکھی　　سزا یہ دنیا نے بخشی ہے بے نوائی کی

پتہ چلا یہ بہت بعد میں کہ دشمن تھا　　وہ جس نے اجنبی رستوں میں رہنمائی کی

رہا جو ساتھ تو مجموعۂ صفات تھا میں　　بچھڑ گیا تو ہر اک سے مری برائی کی

زمانہ یادؔ تاریخ جسے سمجھتا ہے
اسی نے مجھ سے بہرگام بے وفائی کی

☆☆☆

ضمیمہ

سیرِ گل

خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
(انیسؔ)

تمہید

۱۹۹۶ء کے بعد جو شعراء و شاعرات ضلع سانگھڑ کے ادبی افق پر ابھرے انہیں ضمیمے میں شامل کیا گیا ہے تاہم ان میں تین شعراء پرسرام ضیاء، پریل فقیر پیار اور مینوں رام کا تعلق قیام پاکستان سے پہلے کے سندھی شعراء میں ہوتا ہے۔ ۱۹۹۶ء تک ان کی اردو شاعری کے بارے میں واضح ثبوت دست یاب نہ ہونے کی بنا پر اس وقت ان کا تذکرہ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اسی طرح ثروت سعیدی، سالک الہاشمی، سرشار صدیقی، شاہد کاظمی، لیاقت علی نیر، جبرئیل رام پوری اور وارث اقبال کے بارے میں بھی یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ ان کا تعلق بھی ٹنڈو آدم ضلع سانگھڑ سے رہا ہے۔

اس حصہ میں کل ۳۱ شعراء اور ۳ شاعرات کا تذکرہ موجود ہے۔

آزرین فرحت

آزرین فرحت، سانگھڑ کے بزرگ شاعر جوزف اقبال بسمل کی صاحبزادی ہیں۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئیں۔ بی اے، بی ایڈ اور ایم ایڈ کیا۔ درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ شادی کے بعد ۱۹۸۹ء میں کراچی منتقل ہو گئیں۔ ان کے شوہر "زیفرین" نامور مصور ہیں۔

آزرین نے ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی، شاعری ورثہ میں ملی۔ اس کے علاوہ بھی قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

وہ شاعرہ ہونے کے علاوہ، اسٹیج شو کی باصلاحیت کمپیئر بھی ہیں۔ ادبی تقریبات اور مشاعروں کی نظامت ہو یا غیر ملکی ڈراموں اور فلموں کی اردو ڈبنگ۔ ان کی آواز کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ قدرت نے آزرین کو شیریں دہن اور خوش گفتاری کے اوصاف سے متصف کیا ہے، وہ ایک خوش اطوار اور خوش اخلاق خاتون ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ حلیم الطبع اور ملنسار پایا، وہ خلوص و مہر و وفا کا پیکر ہیں۔

کراچی کی ادبی فضا میں اتنی جلدی اپنی جگہ بنالینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ آزرین نے اپنے کلام اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اپنی حیثیت کو منوایا اور مختصر عرصے میں ادبی اُفق پر ایک روشن ستارہ بن کر ابھریں۔ آج وہ کراچی اور کراچی سے باہر مشاعروں میں مدعو کی جاتی ہیں۔

آزرین کا اوّلین مجموعہ کلام "ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں" ۲۰۱۳ء میں کراچی سے شائع ہو کر دنیائے ادب میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ آزرین کی قلبی کیفیات اور محسوسات کا آئینہ دار ہے۔ آزرین محض ادب برائے ادب کی قائل نہیں ہیں بلکہ مقصدیت و افادیت ہمیشہ اس کے پیش نظر ہے۔ کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعی ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہیں اور یہ کام وہ "محبت" کی کارفرمائی سے لینا چاہتی ہیں۔ لفظ "محبت بقول محسن بھوپالی، آزرین کی شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

نمونہ کلام

غزل:

درد کو ایک صدا ہونے تک دیکھا ہے
ہر منظر دھندلا ہونے تک دیکھا ہے

آنکھیں پانی کے پہلو میں رکھی ہیں
پھر ان کو صحرا ہونے تک دیکھا ہے

تشنہ ہونٹوں پر شبنم کی ایک ہی بوند
بوند کو پھر دریا ہونے تک دیکھا ہے

خشک ہوائیں کھیل رہیں ہیں پلکوں سے
خوابوں کو تنہا ہونے تک دیکھا ہے

شہر کی رونق جانے کب تک لوٹے گی
لمحوں کو عرصہ ہونے تک دیکھا ہے

یہ بے وقت کا رونا، ہنسنا، پاگل پن
ہم نے عشق سزا ہونے تک دیکھا ہے

وقت خراشیں چھوڑ گیا دل پر فرحتؔ
سوکھا پیڑ ہرا ہونے تک دیکھا ہے۔

نظم:

ہاں! محبت یہ نہیں کہ ہاتھ میں ہوں ہاتھ اور بیٹھے رہیں
ہاں! محبت یہ نہیں کہ پیار کی ہو بات اور کہتے رہیں
رسم الفت یہ نہیں جذبات کی رو میں ہم بہتے رہیں
بس محبت ہے یہی
اک دوسرے کی روح تک کو جان لیں
اک دوسرے کی سوچ کو پہچان لیں

☆☆☆

ابو محمد سرمد

شہداد پور کے جواں فکر شاعر ابو محمد سرمد شہاب ۵، جون ۱۹۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد ذاتی کاروبار سنبھالا۔ مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا، دوست احباب کے ساتھ بزم ادب شہداد پور کے مشاعروں میں بطور سامع شریک ہونے لگے۔ یہیں سے ذوقِ شعر گوئی نے سر اُٹھایا تو خود کہنے لگے۔ ڈاکٹر فدا انصاری اور داؤد بھٹی سے مشورۂ سخن لینا شروع کیا۔ ۲۰۰۰ء سے بطور شاعر مشاعروں میں پڑھنا شروع کیا۔ جلد ہی شہداد پور کے اچھے شاعروں میں جگہ بنالی اور شہداد پور سے باہر مختلف شہروں میں مدعو کیے جانے لگے۔

غزل کہتے ہیں اور غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ جون ایلیا سے متاثر ہیں اس کے علاوہ گلزار اور منیر نیازی کو بھی پسند کرتے ہیں۔ میران شہاب، انعام ندیم اور اکبر معصوم سے خاصی نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں جب کہ ناچیز ان کی نیازمندی کا دم بھرتا ہے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

آئینہ جب بھی روبرو آئے ایسا لگتا ہے جیسے تو آئے
رات اِک خواب کے جزیرے پہ ہم سے کرنے وہ گفتگو آئے
ہم تو وہ ہیں جو ایک اشارہ پہ ہفت افلاک کو بھی چھو آئے
سجدۂ عشق وہ ادا کرنے آج مقتل میں باوضو آئے
میرؔ کے شعر کی طرح سرمدؔ
شعر اچھا کبھو کبھو آئے

غزل نمبر ۲:

تنہائی اکثر مجھ میں کر لیتی ہے گھر مجھ میں
خود میں گم ہو جاتا ہوں ہے ایسا منظر مجھ میں
پنچھی دور سے آتے ہیں شاید ہے کیکر مجھ میں
تیری یاد جب آتی ہے چلتے ہیں خنجر مجھ میں
تیری خاطر کھلتے ہیں جانے کتنے در مجھ میں
ہر پل تشنہ رہتا ہوں
پیاسا ہے اک تھر مجھ میں

☆☆☆

اسلام الحق آزاد

اسلام الحق متخلص بہ آزاد۔ ۵ رجولائی ۱۹۳۲ء کو ریاست بیکر (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ ٹنڈو آدم آئے۔ ۱۹۶۸ء میں بی اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور سندھ کے مختلف شہروں میں تعینات رہنے کے بعد ۲۰۰۱ء میں مدت ملازمت مکمل ہونے پر اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

اسلام الحق آزاد، عجب آزاد مرد ہے۔ تمام عمر تجردانہ گزاری لیکن نہایت وضع داری کے ساتھ اور یہ وضع داری بہ شرط استواری اب بھی قائم ہے۔ شخصیت میں حد درجہ وقار ہے۔ یہ وقار کبھی قلندرانہ نظر آتا ہے تو

کبھی سکندرانہ۔ نشست و برخاست اور گفت و شنید میں ایسا رکھ رکھاؤ ہے کہ بسا اوقات تصنع معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔ یہ رکھ رکھاؤ ان کی شخصیت کا خاصا ہے۔ عام بول چال میں بھی نہایت ستھرے اور شستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن علمی ادبی حلقے میں بیٹھے ہوں تو گفتگو مسجع و مقفیٰ ہو کر اردو کی قدیم تہذیب کی آئینہ دار محسوس ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کی گفتگو کبھی رجب علی بیگ اور کبھی محمد حسین آزاد کی نثر کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

اسلام الحق آزاد نے پوری زندگی مطالعہ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ کتاب سے ایسی دوستی جوڑی کہ پھر کسی اور دوستی کو ضروری نہیں سمجھا۔ جہاں مطلب کی کتاب نظر آئی فوراً خرید لی۔ زندگی میں ایک ہی کام کیا، بک اسٹالوں اور کتاب بازاروں میں سارا سارا دن سرگرداں رہ کر اپنے مطلب کی کتابیں خرید خرید کر گھر بھرتے رہے یہاں تک کہ گھر چھوٹا پڑ گیا لیکن کتابوں کی طلب میں کمی نہیں آئی۔ کون سا ایسا موضوع ہے جس پر ان کے پاس کتاب نہ ہو اور کون سا ایسا موضوع ہے جس پر کتاب اور مصنف کے حوالے کے ساتھ مدلل گفتگو نہ کر سکیں۔ وہ اپنے سینے میں علم و حکمت کا بیش بہا خزانہ رکھتے ہیں۔

اسلام الحق آزاد کے ساتھ میری کم و بیش دو دہائیوں سے شناسائی ہے پہلے الوارث ہوٹل اور بعد میں کیفے شیراز ین میں ان سے بیٹھک رہتی تھی۔ وہ ان دونوں جگہوں پر اکثر پروفیسر اقبال مغل کے حلقۂ احباب میں بیٹھے نظر آتے تھے جس میں ڈاکٹر احمد، ارشد جالندھری، آفتاب احمد خان، سراج الدین (سابق جج)، عبدالرزاق ہاشمی، نواز علی سموں اور عبدالمجید انصاری شامل ہوتے تھے۔ اس حلقے کی بحثوں میں بھی اسلام الحق آزاد کا نقطۂ نظر سب سے جدا ہوتا اور کبھی کبھی یہ نقطۂ نظر اختلاف رائے بن کر ہفتوں اور مہینوں کے لیے ان کے درمیان ایک "میز" کا فاصلہ پیدا کر دیتا، یوں اسلام الحق آزاد، آزادی کے ساتھ الگ میز پر بیٹھ کر کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے۔

مارچ ۲۰۰۹ء میں اسلام الحق آزاد نے "جذبات و تاثرات" کی اشاعت کے ساتھ اپنے ادیب ہونے کا اعلان کیا۔ ۳۵۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنی نوعیت کا منفرد مجموعہ ہے۔ جو اسلام الحق آزاد کی ۷۰ سالہ زندگی کے تجربات، مشاہدات اور مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے مضامین، شذرات اور غزلیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔

اسلام الحق آزاد گذشتہ برس مستقل طور پر کراچی منتقل ہو گئے۔ سنا ہے آج کل وہ اپنے نئے مجموعے کی اشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ بھی پہلے مجموعہ کی طرح یقیناً منفرد و اہم ہوگا۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر۱:

پھر وہی شام و سحر یاد آیا
پھر وہی رشکِ قمر یاد آیا

جس کے سائے میں کبھی بیٹھے تھے
دھوپ میں پھر وہ شجر یاد آیا

مصلحت کوشی کے ہنگاموں میں
پھر کوئی اہلِ نظر یاد آیا

پھر کسی حادثۂ نو غم پہ
پھر کوئی نورِ نظر یاد آیا

لرزشِ جبر کو جب بھی دیکھا
تو کوئی خونیں جگر یاد آیا

بے خودی خوب ہے آزاد مگر
کیا کریں گے وہ اگر یاد آیا

غزل نمبر۲:

نظر جب سے ملی ان کی نظر سے
ہیں اپنے آپ سے ہم بے خبر سے

دلوں میں ہوتی ہے ہلچل سی پیدا
نظر ملتی ہے جب ان کی نظر سے

عجب ان کی ہے یہ برہم مزاجی
ذرا سی بات پہ وہ ہم پہ برسے

نہ ہو نازاں کبھی اوجِ شرف پہ
کہ جھکتے ہیں شجر بارِ ثمر سے

عجب ہے کیفِ حسن و انس آزاد
ہوئی ہے گفتگو قلب و نظر سے

☆☆☆

پرسرام ضیا

شری پرسرام ہیرانند چھبرانی ضیاؔ ۱۱ جولائی ۱۹۱۱ء کو ٹنڈو آدم کے ایک قدرے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پرائمری کے چار درجوں کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ کر فکرِ معاش میں لگ گئے۔ کچھ عرصہ حیدرآباد اور کراچی میں پرنٹنگ پریس کے کام سے منسلک رہے لیکن یہ ملازمت ان کے شاعرانہ مزاج اور طبیعت کو زیادہ نہیں بھائی چناں چہ جلد ہی گراموفون کمپنیوں سے وابستگی اختیار کر لی اور نغمہ نگاری شروع کر دی۔ ان دنوں سندھی موسیقی کی دنیا میں ماسٹر چندر کا طوطی بولتا تھا چناں چہ ان کے لیے کلام لکھنا شروع کیے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر چندر کی آواز نے پرسرام کو سندھ اور ہند کی سندھی کمیونٹی کا محبوب شاعر بنا دیا۔ تقسیم کے فوراً بعد مستقل طور پر الہاس نگر بمبئی چلے گئے جہاں ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا۔

پرسرام ضیاؔ نے شاعری کا آغاز چودہ سال کی عمر میں ہی کر دیا تھا۔ ابتداء میں عطا محمد سے اصلاح لیتے تھے ان دنوں "پرسو" اور "زیجور" تخلص کرتے تھے۔ بعدازاں شیخ مراد علی کاظم سے رجوع ہوئے اور ان کی تجویز پر ضیاؔ تخلص اپنا لیا۔ پرسرام نے کاظم صاحب سے چار سال تک عروض اور فنِ شاعری پر اکتسابِ علم کیا۔

پرسرام کو ان کی سندھی شاعری پر ۱۹۴۳ء میں اس وقت کی سندھ حکومت نے جب کہ ۱۹۵۸ء میں بھارت کی وزارتِ تعلیم نے حسنِ کارکردگی ایوارڈز سے نوازا۔

پرسرام ضیاؔ کے کئی شعری مجموعے ان کی زندگی میں اور چند ایک بعد از مرگ شائع ہوئے۔ وہ بنیادی طور پر سندھی زبان کے شاعر تھے تاہم ہندی اور اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ان کا ایک اردو فلمی گیت:

ع بڑی بھول ہوئی تجھے پیار کیا ۱؎

بہت مقبول ہوا۔ پرسرام ضیا کا کلام ان کے سعادت مند بیٹے شری نارائن داس کرم چند چودھری (حال، مقیم الہاس نگر، بمبئی) کے پاس محفوظ ہے جو اس اثاثے کی اشاعت میں کوشاں ہیں اور "ضیا" کے عنوان سے ایک سہ ماہی مجلہ بھی شائع کرتے ہیں، جس میں اپنے والد کے غیر مطبوعہ کلام کو اچھی خاصی جگہ دیتے ہیں۔ اس مجلہ تک، باوجود کوشش رسائی نہیں ہو سکی اور نہ ہی پرسرام ضیاؔ کا اردو کلام دست یاب ہو سکا جسے بطور نمونہ پیش کیا جا سکے۔

چوں کہ پرسرام ضیاؔ ضلع سانگھڑ میں اردو شاعری کا ایک قدیم حوالہ ہیں اس لیے ان کا تذکرہ یہاں ضروری سمجھا گیا۔

☆☆☆

۱؎ سہ ماہی "بلیٹن" والیم ۱۱، نمبر ۲۱-۴۰، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، آدی پور، کچھ۔

پریل فقیر پیتارؔ

۱۹۱۱ء میں سابق ریاست خیر پور میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ ضلع سانگھڑ کے ایک چھوٹے سے قصبے "بیرانی" میں آکر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۹ء میں پریل کو پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا لیکن "فائنل پاس" کے بعد ترک تعلیم کر کے تلاش روزگار میں لگ گئے۔ ان کے والد بہت اچھے راگی (گویا) تھے۔ چناں چہ پریل نے بھی والد کے نقش قدم پر چل کر فن موسیقی میں مہارت حاصل کی۔ اسی دوران شاعری کی جانب راغب ہوئے۔

پریل فقیر کا تعلق نسلاً ہندوؤں کی "بھیل" قوم سے تھا۔ تاہم والد کی طرح ان کی طبیعت بھی درویشانہ وقلندرانہ تھی۔ صوفیا اور اولیاء کرام سے بے پناہ عقیدت اور محبت کی بنا پر نام کے ساتھ "فقیر" لگاتے تھے۔ منظہار فقیر راجڑ سے حد درجہ انسیت تھی۔ انہیں اپنا استاد کہتے تھے۔ راجڑ صاحب کے توسط سے مخدوم غلام محمد آف ہالا کے ہاتھوں بیعت ہوئے اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

پریل فقیر، پریلؔ اور پیتارؔ تخلص کرتے تھے۔ سندھی، سرائیکی، ہندی اور اردو میں شعر کہتے اور گاتے تھے۔ اپنی زندگی میں اپنے جملہ کلام پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا جسے شایع کرانا چاہتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ سنا ہے یہ ترتیب شدہ کلام ان کے خاندان کے کسی فرد کے پاس موجود ہے جو تھرپارکر کی جانب نقل مکانی کر چکا ہے۔

ان کا بھی کلام باوجود تلاش وجستجو کے دست یاب نہیں ہو سکا۔

☆☆☆

ٹیکوں رام

سوامی ٹیکوں رام، ۶ ر جولائی ۱۸۸۷ء کو کھنڈو (ضلع تھرپارکر/ضلع نمیاری) میں چیلا رام کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام کرشن دیوی تھا۔ ماں اور باپ دونوں سادھوؤں، بھگتوں اور درویشوں سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے، اور ان کی خدمت کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔ چناں چہ ٹیکوں رام کی طبیعت بھی بچپن ہی سے اس طرف مائل ہو گئی۔ روایتی تعلیم کو ابتدا میں ہی خیر باد کہہ کر جنگلوں اور ویرانوں میں تنہا غور و فکر کو اپنی عادت بنا لیا۔ اس عادت نے اسے دنیاوی رغبت سے بیگانہ کر دیا۔ وہ سنتوں، بھگتوں اور صوفیا کی محفلوں میں جانے لگے۔ کئی کئی میل پیدل چل کر بھٹ شاہ پہنچ جاتے اور شاہ بھٹائی کے مزار پر راگ رنگ کی محفلوں میں صوفیانہ کلام سنتے۔ شاہ بھٹائی، بلھے شاہ، حافظ شیرازی اور بھگت کبیر کے کلام کا طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ خود بھی ان کے رنگ میں کہنا شروع کر دیا۔ تاہم سنت شری آسو رام سے ملاقات نے ان کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ٹیکوں رام نے محبت اور روشنی کے پرچار کے لیے "پریم پرکاش منڈل" قائم کیا اور اپنے سندھی اور ہندی کلام کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں ایک "سنت کوی" (Saint poet) کے طور پر ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور مریدوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ چناں چہ انہوں نے اپنے آبائی گاؤں کھنڈو سے ترکِ سکونت کر کے قریبی شہر ٹنڈو آدم میں ریت کے ایک اونچے ٹیلے پر اپنا آستان تعمیر کیا جو "امرپورا آستان" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس آستان کا صدر دروازہ آج بھی قائم ہے

اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ مئی ۱۹۴۳ء تک یعنی تادم مرگ، سوامی ٹیٹوں رام اس آستان کو مرکز بنا کر دور دراز سے آنے والے اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں میں اپنے اشلوکوں کے ذریعے پند و نصائح میں مشغول رہے۔ آستان پر ہر شام راگ رنگ کی محفل ہوتی جس میں ٹیٹوں رام خود باقاعدگی سے کھڑتال اور یکتارے پر اپنا کلام گا کر سناتے۔

تقسیم کے بعد ان کے زیادہ تر عقیدت مند اور مریدین بھارت چلے گئے اور جے پور کو پریم پرکاش منڈل کا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔ اس وقت ہندوستان کے درجنوں جب کہ دنیا کے لگ بھگ ۳۵ ملکوں میں سوامی ٹیٹوں رام کے نام سے آستان قائم ہیں۔

سوامی ٹیٹوں رام کا زیادہ تر کلام سندھی زبان میں ہے تاہم ہندی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا مجموعی کلام "پریم پرکاش گرنتھ" اور سندھی کلام "امراپوروائی" جب کہ ان کی زندگی کی تفصیلی کتھا "ست گرو سوامی ٹیٹوں رام مہاراج جو جیون چرتر" جے پور بھارت سے شائع ہو چکے ہیں۔ تاہم ایک رسالہ "پریم پرکاش سندیش" اب بھی ہر ماہ الہاس نگر بمبئی سے شائع ہوتا ہے۔

میں نے ان کا سندھی اور ہندی کلام جو ان کے "جیون چرتر" میں درج ہے، بھگت راجو بابا (جھولے لعل مندر ٹنڈو آدم) کے توسط اور معاونت سے پڑھا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹیٹوں رام۔ شاہ بھٹائی، بابا بلھے شاہ اور بھگت کبیر سے حد درجہ متاثر تھے۔ اور حافظ شیرازی کو بھی پسند کرتے تھے۔ مجھے ان کے دست یاب مجموعے میں خالصتاً اردو کلام کہیں نظر نہیں آیا تاہم ان کے ہندی کلام میں قدیم اردو کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کا مجموعی کلام (پریم پرکاش گرنتھ) جو فی الحال دستیاب نہیں، کے بارے میں بھگت راجو بابا کا کہنا ہے کہ اس میں ایسا کلام موجود ہے جسے ہم اردو کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔

نمونۂ کلام

(۱)

بے پرواہی، کیرتی، شانتی اور بھگوان
کہے ٹیٹوں سنسار میں، چاہت انسان

(۲)

یا نج آتم گیان ہو، یا ہو پراُپکار
ٹیٹوں جس میں یہ نہیں، مانش سو بے کار

(۳)

رے من، میرا مان وچن یہ
اکیارت مت بولو رے
پہلے اپنے ہردے اندر
سوچ ترازی تولو رے
ستیہ وچن مُنہ مدر ہویا جو
تاکو مکھ سے کھولو رے
کہتا مجنوں تب ہی تیرا
ہو وے بول امولو رے

(۴)

رے من میرا سمجھ سویرا
جگ کا یہ ویلا ہے
بہت جنم کے بچھڑے ہو تم
اِتھوں پھرت اکیلا ہے
منش جنم میں پاربرھم سے
کرنا تجھ کو میلہ ہے
کہے مجنوں جے اب نہیں ملیا
پھر تو ملن ڈھیلا ہے

☆☆☆

ثروتؔ سعیدی

سید ثروت علی نام، ثروتؔ تخلص، ۱۹۳۶ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ جوہر سعیدی کے صاحبزادے اور اختر سعیدی کے بڑے بھائی تھے۔ ہجرت کے بعد ۱۹۶۰ء تک ٹنڈو آدم میں قیام رہا، بعد ازاں خاندان کے ساتھ لانڈھی کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں ۱۹۷۶ء کو رحلت فرمائی۔

ٹنڈو آدم سے میٹرک اور کراچی سے انٹر کرنے کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ صحافت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ روزنامہ جنگ کراچی میں تادمِ مرگ صحافتی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

ادبی گھرانے کا فرد ہونے کی وجہ سے بچپن ہی میں شاعری کی جانب راغب ہوئے۔ دردؔ سعیدی اور اپنے والد جوہر سعیدی سے اصلاح لینے لگے۔ دردؔ سعیدی سے بے حد انسیت اور محبت تھی۔

نمونۂ کلام

غزل:

شب وعدہ کٹ نہ جائے کہیں کروٹیں بدل کے　　کریں مجھ سے آپ وعدہ تو کریں ذرا سنبھل کے
کبھی ہو سکے نہ پورے ترے وعدے آج کل کے　　ترے واسطے رہا ہوں میں ہمیشہ ہاتھ مل کے
مجھے بزم سے اٹھا دے، یہ مگر ذرا بتا دے　　کہاں جاؤں گا میں آخر، تری بزم سے نکل کے
تری بے توجہی پر میں یہ سوچتا ہوں اکثر　　مرے دل میں رہ نہ جائیں مری حسرتیں مچل کے
کئی گیت میں نے لکھے ترے حسن بے رخی پر　　تری شانِ دلبری میں کئی رنگ تھے غزل کے

مجھے حادثوں کا کیا غم مری آنکھ کیوں ہے پرنم
میں جواں ہوا ہوں ثروت انہی حادثوں میں پل کے

متفرق اشعار:

خلوتوں میں بھی نہیں ان کے تصور کی مہک
جلوتوں سے بھی گریزاں دلِ دیوانہ ہے
کوئی خاکہ، کوئی تصویر، کوئی نقش نہیں
منفرد کتنا مرے دل کا صنم خانہ ہے

سوئے مقتل چلا جنوں میرا
حوصلے دیکھنے کو قاتل کے

یقین کر کہ ضرورت نہیں ہے تیری مجھے
یقین ہے کہ تجھے میری ضرورت ہوگی

☆☆☆

جبرئیل رام پوری

۱۷ ر نومبر ۱۹۴۳ء کو رام پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے ٹنڈو آدم میں آ بسے۔ ان کے والد خان فازی[1] مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے۔

جبرئیل نے نیو علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم سے تعلیم حاصل کی۔ جہاں پروفیسر شاہد کاظمی اور پروفیسر اسرار احمد اسرار کی صحبت میں ادب کا ذوق پیدا ہوا اور نظم و نثر میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ ٹنڈو آدم میں ان کے چند خاص احباب میں یعقوب تارخ قرولوی، اسلام الحق آزاد اور سراج الدین قریشی (سابق جج) کا نام آتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں اپنے والد کے ہمراہ کوئٹہ چلے گئے اس دوران کچھ عرصہ کراچی میں بھی قیام رہا۔

کوئٹہ میں، ابتدا میں مشرق اخبار سے وابستہ رہے بعد ازاں ملازمت کرلی۔ کچھ عرصہ محکمۂ اطلاعات میں رہنے کے بعد واپڈا میں پی۔ آر۔ او۔ ہو گئے۔

قیام ٹنڈو آدم کے دوران ہی حیدرآباد سندھ میں شادی ہوئی۔ صاحب اولاد ہیں اور اس وقت کوئٹہ میں مقیم ہیں۔

کوئٹہ سے مختصر عرصہ کے لیے ایک اخبار "پاکستان" جاری کیا جو بوجوہ بند کرنا پڑا۔

سن ۶۰ کی دہائی میں ٹنڈو آدم سے ان کی شاعری کا اولین مجموعہ "جامِ جبرئیل" شایع ہوا جس میں ایک سیاسی نظم کے علاوہ باقی تمام غزلیات ہیں۔ یہ مجموعہ باوجود کوشش کے دست یاب نہیں ہو سکا۔ بزم ادب نیا علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم کے مجلّہ "جنبش لب" (۱۹۶۹ء) سے ایک غزل بطور نمونہ پیش ہے۔

---

[1] خان فازی ٹنڈو آدم شہر کی سرکردہ سیاسی شخصیت تھے۔ ٹنڈو آدم سے ایک اخبار "جمہور" جاری کیا۔ ان کے دیگر تین بیٹوں کے نام میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل ہیں۔ جبرئیل سب سے بڑے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل:

میں تری بزم سے یوں بے سر و ساماں نکلا — حسرتیں دل میں رہیں کوئی نہ ارماں نکلا
تادمِ زیست تھی تصویر تری پیشِ نظر — دم بھی نکلا تو تری یاد میں کوشاں نکلا
خواب دیکھے تھے ترے پیار میں ہم نے کیا کیا — تجھ سے بچھڑے تو ہر اک خواب پریشاں نکلا
تیری محفل میں گیا کیف نظر سے لیکن — درد پہلو میں لیے چاکِ گریباں نکلا
غمِ زمانے کے ترے غم نے مٹا ڈالے ہیں — تیرا ہی درد ہر اک درد کا درماں نکلا
مسکرا ہی دو مرے حالِ پریشاں پہ کبھی — میں یہ سمجھوں گا مرا کوئی تو ارماں نکلا

ہم سمجھتے تھے کہ جبریل فرشتہ ہوگا
اب جو دیکھا تو وہی حضرتِ انساں نکلا

☆☆☆

جمیل احمد شادانی

۹ر جون ۱۹۷۱ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ گورنمنٹ مرزا قلیچ بیگ پرائمری اسکول میں تعینات ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ عرصہ تک گورنمنٹ نیو علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم میں رضاکارانہ طور پر اردو کی کلاسیں بھی لیتے رہے۔

ایم اے اردو کے دوران ٹنڈو آدم کے مرحوم شاعر ورد سعیدی کی شخصیت اور فن پر مقالہ تحریر کیا۔ جس کی نگراں اس وقت کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر سعدیہ نسیم تھیں۔ انہی دنوں شاعری کا شوق پیدا ہوا اب سے حلقۂ یاران سخن ٹنڈو آدم سے منسلک ہیں۔ غزل کہتے ہیں اور ٹنڈو آدم میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں کلام سناتے ہیں۔

شادانی، جماعت اوّل سے بی اے تک میرے ہم جماعت رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ تعلق اب ایک مضبوط دوستی میں بدل چکا ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

وفاؤں کا صلہ مانگا جو مانگا بھی تو کیا مانگا
محبت بھی عجب شے ہے ہمیشہ راستہ مانگا
کسی نے غم اٹھائے ہیں کسی نے فائدہ مانگا
طلب تھی روشنی کی سو ہتھیلی پہ دیا مانگا
مجھے رکھ کر نشانے پہ خدا سے جانے کیا مانگا
سنوارا زلفِ برہم کو
پھر اس نے آئینہ مانگا

غزل نمبر ۲:

نگاہوں میں بساتے کیا تھا ہی کیا سو دکھاتے کیا
پڑھایا تھا سبق تم کو وفائیں بھی سکھاتے کیا
کہاں سے آئے تھے جانے نگاہیں وہ ملاتے کیا
ضرورت پڑ گئی شاید وگرنہ وہ بلاتے کیا؟
عیاں تھے زخم سب کے سب چھپاتے تو چھپاتے کیا
ابھرتے جا رہے ہیں نقش مٹاتے تو مٹاتے کیا
جمیل ان سے گلہ کیسا
نبھاتے تو نبھاتے کیا

☆☆☆

جاوید خان جاوید

۳ر اپریل ۱۹۷۰ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۹۵ء میں سرکاری ملازم ہوگئے۔ بلوچ محلہ پرائمری اسکول میں معلم کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

بچپن سے مطالعہ کا شوق، شعر و ادب میں رغبت کا سبب بنا۔ مظفر ادیب مرحوم سے مشورہ سخن لینا شروع کیا۔ ۱۹۹۶ء میں حلقۂ یاران سخن کی تنظیمی سرگرمیوں کے بعد رابطے میں آئے اور حلقہ کے تحت منعقدہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے بعد ازاں "بزم ادب ٹنڈو آدم" کی بنیاد ڈالی اور چند ایک شعری نشستوں کا اہتمام کیا جن کی صدارت مظفر ادیب نے کی۔

غزل، نظم، قطعات اور مرثیہ میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ غزل اور نظم خوب کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

صدمے ترے فراق کے ٹالے نہیں گئے
بکھرے ہم اس طرح کہ سنبھالے نہیں گئے

خوش نام ہو گئے یہ الگ بات ہے مگر
رسوائیوں کے تھے جو حوالے نہیں گئے

اب تیرا لطف بھی تو مداوا نہ کر سکا
سینے کے داغ روح کے چھالے نہیں گئے

ماں نے مجھے جگایا تھا ماتھے کو چوم کر
آنکھوں سے آج تک وہ اجالے نہیں گئے

جاوید کر رہے ہو جو شہرت کی جستجو
افسوس تم سے زخم سنبھالے نہیں گئے

غزل نمبر ۲:

سر بلند رہبری میں ہوتے ہیں
سر قلم ہمسری میں ہوتے ہیں

مجھ سے اے دوست بدگماں کیوں ہے
حادثے زندگی میں ہوتے ہیں

تیرگی سوچ بھی نہیں سکتی
جرم جو روشنی میں ہوتے ہیں

دل تو کیا روح تک جلا ڈالیں
وہ شرر آگہی میں ہوتے ہیں

ہم کو دنیا کی کیا خبر جاوید
ہم تو ان کی گلی میں ہوتے ہیں

☆☆☆

رخسانہ ناز

رخسانہ ناز، شادی ہو کر ٹنڈو آدم آئیں۔ سابقہ تعلق کراچی سے ہے تاہم کراچی کے ادبی حلقوں میں گوشہ نشیں رہیں۔ بقول ان کے وہاں چند ایک نشستوں میں شریک ہوئیں اور کلام سنایا۔

ٹنڈو آدم میں بھی ایک عرصہ تک گوشہ نشیں رہیں۔ ۲۰۱۳ء میں حلقۂ یارانِ سخن ٹنڈو آدم کے پانچویں کل پاکستان مشاعرے سے چند روز قبل حبیب خان یوسف زئی (سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ) کی معرفت ان کے میاں سے ملاقات ہوئی جن کے توسط سے انہیں دعوت دی گئی اور اس دعوت پر انہوں نے مشاعرے میں شریک ہو کر کلام پڑھا اور خوب داد سمیٹی۔

نمونہ کلام

غزل:

کب جنوں کا یہ سلسلہ ٹھہرا عشق بھی ایک مسئلہ ٹھہرا

کب تھمے راہِ عشق میں پاؤں ان پہ کب کوئی آبلہ ٹھہرا

ٹھہر پائے نہ اب چراغ کوئی یہ ہواؤں کا فیصلہ ٹھہرا

ہم تو اک پل بھی چل نہ پائیں گے یہ تو صدیوں کا فاصلہ ٹھہرا

راستے میں تو تیرا شہر بھی تھا پر کہاں میرا قافلہ ٹھہرا

زخم کھا کے بھی مسکراتا ہے

یہ تو بس اس کا حوصلہ ٹھہرا

☆☆☆

سالک الہاشمی

سید عبداللہ ہاشمی المتخلص بہ سالک۔ ۱۹۲۲ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ٹنڈوآدم ہجرت کی جہاں ۱۹۵۳ء تک قیام رہا۔ بعدازاں کراچی چلے گئے جہاں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔

شاعری کا آغاز ٹونک کی ادبی فضا میں ہوا جب کہ علی گڑھ میں جوہر کھل کر سامنے آئے۔ حسرت موہانی سے تلمذ تھا۔

نمونہ کلام

متفرق اشعار:

سمجھے گا کیا ہمارے مراتب امیر شہر
ہم بوریا نشینوں کے گھر کے چراغ ہیں

ہم اس نظام کو دنیا سے اب مٹائیں گے
جو رنگ و نسل کا انساں میں امتیاز کرے

کبھی جو زلف پریشاں ہوئی ہے اے سالک
الجھ پڑے ہیں ہواؤں سے ان کے دیوانے

نہ جانے کتنے ہی انساں پڑے ہیں سڑکوں پہ
کہ زندگی بھی نہ مانے جنھیں بہ قید حیات

☆☆☆

سرشار صدیقی

امان اللہ نام، سرشار تخلص ہے۔ ۱۹۲۶ء کو بھارت کے شہر کانپور میں پیدا ہوئے۔ مئی ۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے ٹنڈو آدم آئے اور مقامی اسکول میں معلم ہو گئے۔ درد سعیدی، قمر ہاشمی، جوہر سعیدی اور سالک الہاشمی کے ساتھ یہاں چند برس گزارے بعد ازاں کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آج اردو ادب کے اُفق پر بڑی آب و تاب سے جگمگاتے ہیں۔

حضرت مولانا حسرت موہانی سے قربت رہی۔ تحریک آزادی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

ابتداء میں عملاً اشتراکی بل کہ انقلابی تھے لیکن اس وقت بھی مسلمان ابن مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے اور اپنی پہچان کے لیے اپنے نام کے ساتھ "صدیقیت" کا امتیازی نشان ناگزیر سمجھتے تھے۔

۱۹۵۳ء میں شادی ہوئی اور اسی سال نیشنل بینک آف پاکستان کراچی میں ملازمت اختیار کر لی۔

شاعری کا آغاز ۱۹۴۳ء میں کانپور کی ادبی فضا میں ہوا۔ اسی سال "نگار لکھنؤ" میں پہلی غزل شایع ہوئی۔ ہجرت کے بعد ٹنڈو آدم اور پھر کراچی میں ادبی حلقوں میں سرگرم ہو گئے۔

محشر بدایونی، فیض احمد فیض، ندا فاضلی، احمد فراز، جاں نثار اختر، واصل عثمانی، نشور واحدی، کرار نوری، جوہر سعیدی، نگار صہبائی اور عبید اللہ علیم وغیرہ سے خاص تعلق داری رہی۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر، امریکا، کینیڈا اور بنگلہ دیش کا ادبی سفر کیا۔

غزل، نظم، نعت اور ہائیکو میں طبع آزمائی کی۔ کئی مجموعے شایع ہوئے جن میں پتھر کی لکیر (پہلا شعری انتخاب) ۱۹۶۲ء، زخم گل (طویل منظوم تمثیل) ۱۹۶۵ء، ابجد (ابتدائی شاعری) ۱۹۸۲ء، حرف مکرر (اہم کتابوں پر اظہار خیال) ۱۹۸۲ء، بے نام (نظمیں اور غزلیں) ۱۹۸۳ء، خزاں کی آخری شام (قومی شاعری)، اساس (حمد و نعت و منقبت) ۱۹۹۰ء، شنیدہ (ادبی مضامین) ۲۰۰۱ء اور اجمال (تجزیاتی و تاثراتی اظہار) ۲۰۰۱ء، شامل ہیں۔

نمونۂ کلام

نعت:

اُنؐ کے در کی گدائی پا کر میں تو بہت مغرور ہوا
جنؐ کے غلاموں میں کوئی سرمد کوئی منصور ہوا

حمد حرم میں بیٹھ کر لکھی نعت حضورؐ کے قدموں میں
روح وہاں سیراب ہوئی تھی قلب یہاں معمور ہوا

دور سے گنبدِ خضرا دیکھ کے دل اس طور سے دھڑکا
روح کے گہرے سناٹے میں جیسے شورِ نشور ہوا

میں نے بھی آج اپنے رب سے اپنے دل کی باتیں کیں
دامنِ کوہِ صفا تو مجھ کو وادیٔ کوہِ طور ہوا

اس ظاہر عاصی سرشار کی قسمتؔ پہ رشک آتا ہے
دولتِ حسنِ شفاعت پائی اور مقبول مشہور ہوا

متفرق اشعار:

مرے لہو میں ہے تاثیر نسبتِ صدیقؓ
مجھے تو گھر سے ملا عشقِ مصطفیؐ کا شعور

اسی کاوش میں عمر ہوگئی صرف
لکھ سکوں اپنی سوچ حرف بہ حرف

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن بھی اس طرح گزارے کوئی

جو بے وطن ہوئے ان کا وطن زمانہ ہوا
جو بے زمیں ہوئے ان کا کہاں ٹھکانہ ہوا

☆☆☆

شاکر محمود ضلع سانگھڑ کے ایک چھوٹے سے قصبے جیرانی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی عبدالجلیل راجپوت علاقے اور برادری میں اچھا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

شاکر محمود نے کیڈٹ کالج پٹارو میں تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر شفیق جیلانی کی صحبت میں شعر فہمی کا ذوق پیدا ہوا۔ نظم نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپریل ۱۹۹۳ء میں ان کی نظموں کا اوّلین مجموعہ "شامِ وداع" منظرِ عام پر آیا، جس میں کل ۳۶ مختصر نظمیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کا مضمون بعنوان "تخلیقی منظرنامہ" شاملِ اشاعت ہے، جب کہ فلیپ پر منیر نیازی، ڈاکٹر تنویر عباسی اور امداد حسینی کی آراء موجود ہیں۔

شاکر محمود ان دنوں بسلسلہ ملازمت کراچی میں مقیم ہیں۔

نمونۂ کلام

نظمیں:

حریم جاں

خوابوں جیسا ایک نگر ہے
سکھ میں سوئی گلیاں ہیں
اک گلی کے موڑ پر
البیلی مہکاروں والے
پھولوں سے ڈھکا ہوا
سرخ اینٹوں کا مکاں
اس مکاں کی خلوتوں میں
اس کے کومل قدموں کی
آہٹیں آباد ہیں
طلسمی جمال کے
جلوہ ہائے ناز کی
جنتیں آباد ہیں

تسلی

پھر چاندنی راتیں آئیں گیں
پھر گھور گھٹائیں چھائیں گیں
دل میں ہوک اُٹھائیں گیں
اور تجھ کو بہت رلائیں گیں
تب یاد دریچے وا رکھنا
آس کی جوت جلا رکھنا
جو بھی حدیں ہیں ساری مٹا کر
پریت کی ریت نبھاؤں گا
تیرے آنسوں پونچھنے آؤں گا
میں آؤں گا میں آؤں گا

☆☆☆

شاہد کاظمی

اردو کے نامور ڈرامہ نگار اور شاعر شاہد کاظمی ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء تک نیو علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو رہے۔ یہ زمانہ شاہد کاظمی کی جوانی کا زمانہ تھا چنانچہ وہ کالج کی سرگرمیوں خصوصاً ادبی سرگرمیوں میں بہت متحرک رہے۔ وہ کالج کی بزم ادب کے انچارج اور یونین کے صدر بھی رہے۔ انہوں نے بزم ادب کے تحت ایک مجلہ "جنبشِ لب" جاری کیا جس کے چند ایک شماروں کے بعد ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر خاص شمارہ "غالب نمبر" شائع ہوا، جو اس سلسلے کی آخری کاوش تھی۔

ٹنڈو آدم میں رہتے ہوئے شاہد کاظمی کو سندھی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا اور انہوں نے سندھی ادب میں ایم۔ اے کیا۔

شاہد کاظمی صاحب ۱۹۷۳ء میں ملازمت چھوڑ کر کراچی چلے گئے اور اردو ڈرامہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ چند برس قبل کراچی میں وفات پائی۔

نمونہ کلام

غزل:

کتنا خیالِ خاطرِ اہلِ نظر ہے آج — پتھر کو آئینے کے بکھرنے کا ڈر ہے آج
تم کو خبر نہیں ہے تمہیں کیا خبر ہے آج — اک اک نفس بصورت برق و شرر ہے آج
ذروں میں آگئی ہے ستاروں کی دل کشی — تاریکیوں کے رخ پہ بھی حسنِ سحر ہے آج
یہ حسنِ انقلاب ہے یا حسنِ اتفاق — میں ہنس رہا ہوں اور تری چشم تر ہے آج
شعلہ بتاؤ پھول کو یا چاندنی کو آگ — دیوانہ گلستاں سے بہت باخبر ہے آج
کل تک تو لوگ مجھ تماشہ تھے دور سے — سنبھلا مریضِ غم تو ہر اک چارہ گر ہے آج

غالب کی ہر زمین ہے شاہد فلک نما
اردو زباں کا رنگ بہ حسنِ دگر ہے آج

نظم (تلاش):

ڈھونڈتی ہیں مری ویران نگاہیں اس کو
جس کی قربت کے سہارے میں جیا کرتا تھا
جب بھی عفریتِ غمِ دہر ڈراتا تھا مجھے
ایک صورت تھی جسے دیکھ لیا کرتا تھا

ڈھونڈتی ہیں مری ویران نگاہیں اس کو
زندگی کو مری گلزار بنایا جس نے
میرے بے جان ارادوں کو توانائی دی
میری مغموم جوانی کو ہنسایا جس نے

ڈھونڈتی ہیں مری ویران نگاہیں اس کو
جس کی ہر بات مرے دل میں اتر جاتی تھی
جس کی تابندہ محبت کی بدولت مجھ کو
روشنی غم کے اندھیروں میں نظر آتی تھی

ڈھونڈتی ہیں مری ویران نگاہیں اس کو
مصلحت سے نہ کبھی جس نے کوئی کام لیا
خار کو پھول اندھیرے کو اجالا کہنا
جس کی خوددار طبیعت نے گوارا نہ کیا

یہ اسی شخص کی روداد وفا ہے شاہدؔ
جس کو اپنوں نے بڑے پیار سے برباد کیا
اس کو بے مہریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بڑا یاد کیا

☆☆☆

شریف نیّر

محمد شریف نام، نیّر تخلص ہے۔ ۱۹۶۳ء میں سانگھڑ شہر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور فکر معاش میں لگ گئے۔ کچھ عرصہ کوچہ صحافت کی گرد بھی چھانی، سانگھڑ سے ہفت روزہ "صدائے درویش" جاری کیا۔ آج کل ریئل اسٹیٹ کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔

زمانہ طالب علمی میں ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شہر سانگھڑ کی زمین ادب ابھی زرخیز تھی۔ نیّر سانگھڑ کے ادبی حلقے میں اپنا ایک حوالہ رکھتے تھے مشاعروں اور ادبی محافل میں نا صرف شریک ہوتے بل کہ فروغ ادب کے لیے احباب کے شانہ بہ شانہ رہتے تھے۔ ان کا کلام اس دور میں ملک کے معتبر جرائد میں تواتر سے شائع ہوتا تھا۔ آج کل شعری محافل سے دور ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

نظر کو پھر کہیں دھوکا ہوا ہے	یہ چہرہ تو مرا دیکھا ہوا ہے
لگی ہے آگ گھر کے چاروں جانب	مگر وہ بے خبر سویا ہوا ہے
سلگتے موسموں کی دسترس میں	ہر اک چہرہ یہاں جھلسا ہوا ہے

غزل نمبر ۲:

یہاں تو کوئی بھی ایسا نہیں ہے	مگر یہ دل ابھی سمجھا نہیں ہے
پرانے زخم بھرتے جا رہے ہیں	نئے زخموں کا اندازہ نہیں ہے
تمازت سے بدن جلنے لگے ہیں	کہیں پیڑوں تلے سایا نہیں ہے
چرا کر لے گیا ہے خواب میرے	سفر سے جو ابھی لوٹا نہیں ہے

جسے تم ڈھونڈتے پھرتے ہو نیّر
تمہیں وہ شخص کیوں ملتا نہیں ہے

☆☆☆

شوکت علی شوکت ایڈووکیٹ

۷ مارچ ۱۹۵۹ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد پاکستان پوسٹل سروس میں ملازم ہو گئے۔ نوابشاہ سمیت سندھ کے مختلف شہروں میں تقرری کے سبب عارضی قیام رہا۔ کوچہ صحافت کی بھی خاک چھانی اور چند ایک اخبارات سے وابستہ رہے۔ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد نئی بستیاں بسانے کے شوق میں سندھ کے مختلف شہروں میں ہاؤسنگ پروجیکٹس شروع کیے۔ اس شعبہ میں بھی ایک کامیاب بلڈر کے طور پر ابھرے۔ ٹنڈو آدم میں اسی سلسلے میں دو دہائیوں تک قیام رہا۔ آج کل مستقل طور پر حیدر آباد میں سکونت پذیر ہیں۔

ذوقِ شعر گوئی، شہداد پور میں دورانِ تعلیم ۱۹۷۸ء میں پیدا ہوا۔ کالج میں اردو کے پروفیسر شوکت اللہ جوہر کی رہنمائی میں شعر کہنے لگے اور ۱۹۸۷ء میں باقاعدہ طور حیدر آباد کے استاد شاعر حضرت واجد سعیدی کے حلقۂ تلمذ میں آ گئے۔ ان دنوں مشاعروں میں سرگرمی کے ساتھ شرکت کرتے ہیں مختلف ادبی انجمنوں "ادب کچہری حیدر آباد" اور "حلقۂ یارانِ سخن سندھ حیدر آباد شاخ" میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔

حیدر آباد سے ایک سہ ماہی ادبی جریدہ "ارتقاء" بھی نکالتے ہیں۔ حلقۂ احباب بہت وسیع ہے تاہم پروفیسر عتیق جیلانی، پروفیسر مرزا سلیم بیگ، وقار قریشی، راحت عارفی اور آفتاب عالم قریشی سے زیادہ قریب ہیں۔ مجھے بھی ان سے نیاز مندی کا اعزاز حاصل ہے۔

شاعری میں غزل، نظم، قطعات، نعت اور سلام میں طبع آزمائی کرتے ہیں تاہم غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔

شوکت علی شوکت کا اوّلین مجموعہ کلام زیرِ طبع ہے۔ یقیناً ان کا یہ مجموعہ کلام دنیائے ادب میں ان کا ایک مضبوط حوالہ ثابت ہوگا۔

نمونۂ کلام

غزل:

آئینہ بے جمال کر ڈالا عکس ہی نے کمال کر ڈالا
اک تبسم ہی نے فقط اس کے مجھ کو بسمل مثال کر ڈالا
ماہ و انجم کی بات کرتے ہو ہم نے پتھر کو لال کر ڈالا
ایک ظالم نے پھول سے دل کو راہ میں پائے مال کر ڈالا
طائرانِ چمن کو یہ کس نے آج پھر بے ملال کر ڈالا
اک وڈیرے نے زر کے نشے میں قتل پھر ماں کا لال کر ڈالا
عشق ہی نے تو حسن کو شوکتؔ
تا ابد لازوال کر ڈالا

متفرق اشعار:

درد نبیؐ کا فیض ہے قسمت میں دوستو تشنگی رہی نہ کوئی تیرگی رہی

شوکتؔ نہیں رہی مجھے دولت کی آرزو ہاتھوں میں میرے گوہر نایاب آ گیا

ختم نفرت کا جب دھواں ہوگا سبز و شاداب یہ جہاں ہوگا

لکھوں اس کو شوکتؔ جواب کیا کئی رخ ہیں اس کے سوال کے

خدا نے یہ عطا کی شان و شوکت کسی کے سامنے سر خم نہیں ہے

☆☆☆

صنوبر راؤ

صنوبر راؤ ۱۹۶۳ء میں شہداد پور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۹۰ء میں سندھ یونی ورسٹی جامشورو سے بی فارمیسی میں ڈگری لی۔ ڈاکٹر عبدالستار راؤ سے شادی کے بعد گھرداری میں مصروف ہوگئیں۔

صنوبر کے بڑے بھائی محمد علی مضطر بھی شاعر ہیں۔ چناں چہ انہیں بچپن ہی سے شعری ماحول ملا۔ حساس طبیعت نے احساسات اور جذبات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا ہنر بخشا۔ شادی کے بعد شوہر کی تحریک پر اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کا قصد کیا اور شہداد پور کے نوجوان شاعر انعام عدیم کے تعاون سے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ "محبت راستے بناتی ہے" منظر عام پر لائیں۔

صنوبر راؤ ادبی دنیا سے کنارہ کش ہیں۔ مشاعروں میں شرکت نہیں کرتیں تاہم ان کا تخلیقی سفر رواں دواں ہے۔ میرے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر حبیب منہار، نے توسط سے مجھے موصوف کا مجموعہ کلام دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مجموعہ میں ۲۱ نثری نظموں سمیت کل ۸۰ نظمیں، ایک غزل اور چند مختلف اشعار ہیں۔ تمام نظمیں مختصر مگر پراثر ہیں۔ فردی اشعار اور غزل بھی عمدہ ہے۔ غالب کی زبان میں اگر یہ کہا جائے کہ صنوبر کی شاعری سادگی و پرکاری کا نمونہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

نمونۂ کلام

تثلیث:

تیرا درد

دردِ تیرا تھا
اس لیے ہم نے
اپنے دل میں آنے
جگہ دی ہے

اداسی

سارے منظر
اداس رہتے ہیں
ایک تیرے
اداس ہونے سے

متفرق اشعار:

تیرے چہرے کو دیکھے جاتا ہے
چاند مجھ کو رقیب لگتا ہے

نہ جانے کیوں مجھے اکثر اداس رکھتی ہے
وہ ایک بات جو تو نے کبھی کہی بھی نہیں

مانگا تھا دعاؤں میں جسے اپنے خدا سے
کیا سانحہ گزرا کہ اُسے بھول گئی ہوں

میں نے ساری شکایتیں کرلیں
اور وہ چپ رہا خدا کی طرح

کبھی جو ہاتھ اُٹھاؤں تو یہ دعا مانگوں
ملے نہ تجھ کو کبھی تجھ سا بے وفا کوئی

موت کا گلہ کرے جس نے
زندگی کا عذاب دیکھا ہو

☆☆☆

طارق سعید

سید محمد طارق سعید مدنی کیم جون ۱۹۷۰ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے اردو، بی ایڈ اور ایم ایڈ کیا۔ ۱۹۹۰ء سے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں علاوہ ازیں ٹنڈو آدم میں ایک نجی اسکول کے مہتمم بھی ہیں۔

حلقۂ یاران سخن ٹنڈو آدم کے رکن ہیں۔ ادبی تقاریب میں شرکت کرتے ہیں۔ میرے اُن چند خاص دوستوں میں شامل ہیں جن کی دوستی پر مجھے ناز ہے۔ سندھ کے مختلف شہروں اور پنجاب کے ادبی سفر پر کئی بار میرے ساتھ رہے ہیں۔ یار باش طبیعت کے ایک مخلص انسان ہیں۔

چند سال سے بطور شاعر مشاعروں میں شریک ہو رہے ہیں۔ غزل اور نعت کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل:

جب سے آیا ہے بال آنکھوں میں
اٹھ رہا ہے سوال آنکھوں میں

تو کبھی غور سے دیکھ آنکھیں
حسن کیا ہے لال آنکھوں میں

چاند اترا تو آکے بیٹھ گیا
رات ان پر ملال آنکھوں میں

کس نے دیکھی ہیں باہنر آنکھیں
کس نے دیکھے کمال آنکھوں میں

خواب تو خواب ہیں مگر طارق
خواب رکھنا سنبھال آنکھوں میں

☆☆☆

طاہر شمشیر

محمد طاہر، ۱۲ رجون ۱۹۶۱ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمشیر علی معلم تھے۔ چناں چہ خود بھی اسی پیشے کو اپنایا۔ ۱۹۸۲ء سے مختلف پرائمری اسکولوں سے وابستہ ہیں۔ دوران ملازمت تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اردو میں ایم اے کرنے کے ساتھ ساتھ بی ایڈ اور فاضل طب وجراحت کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ کچھ عرصہ رضا کارانہ طور پر گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج ٹنڈو آدم میں پرنسپل، پروفیسر کوثر پروین نظاری کی درخواست پر اردو کی کلاسیں بھی لیں اور کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کیا۔ وہ کالج کے سالانہ مجلہ "نازی" کے حصہ اردو کے مدیر بھی رہے۔

دسمبر ۱۹۹۷ء میں شادی ہوئی جو بہ وجوہ قائم نہ رہ سکی اور ۲۰۱۱ء میں میاں بیوی کے درمیان علاحدگی ہوگئی۔

۱۹۹۶ء میں، مجھ سے ملاقات ہوئی، ان دنوں موصوف جمیل احمد شادانی کے ساتھ مل کر ایم اے اردو کی تیاری کر رہے تھے۔ اور مقالہ لکھنے کے خواہش مند تھے۔ میری تجویز پر انہوں نے جوہر سعیدی پر مقالہ لکھا جس کے لیے موصوف نے بہت محنت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں دو دوستوں جاوید عادل اور شاہد بسل کے ساتھ مل کر ٹنڈو آدم کی ادبی رونقیں بحال کرنے کے لیے تنظیم سازی پر غور کر رہا تھا۔ ان دونوں سے ملاقات نے میرے اس خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔ چناں چہ حلقۂ یاران سخن کی بنیاد رکھ دی گئی اور پہلا مشاعرہ طاہر شمشیر کے کوارٹر بمقام ریلوے گراؤنڈ میں منعقد ہوا۔ انہی دنوں موصوف میدان شاعری میں کود پڑے اور طنز و مزاح میں قطعات کہنا شروع کیے۔ بعد ازاں سنجیدہ شاعری کی طرف آگئے۔

نمونۂ کلام

غزل:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں وہ چکر یہ الٹا لگاتا نہیں
کوئی گزرا لمحہ کوئی بات ہو پلٹ کر وہ گردش میں آتا نہیں
برا یا بھلا جو بھی ہم کر چکے کوئی دل بھی اس کو بھلاتا نہیں
ادائیں کہ پیکر ہوں خواہ دلنشیں حیا بے وجہ تو دکھاتا نہیں
کتابی و باتیں جو قصہ ہوئیں کبھی سامنے کوئی لاتا نہیں
تو کر پیدا جوش اور جذبہ نیا کہ انداز تازہ کیا بھاتا نہیں
گلوکار طاہرؔ عزائم ترے ترا وقت پھر مات کھاتا نہیں

☆☆

گھمنڈ کیا ہے فقط جھوٹا دلاسہ
تکبر نخوت و جاہ و حشم کا

☆☆☆

علی رضوان جعفری

یکم مارچ ۱۹۸۲ء کو ضلع سانگھڑ کے قصبہ "جھول" میں پیدا ہوئے۔ سندھی ادبی سنگت جھول کی محافل سے شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا۔ خود کو سانگھڑ کے شاعر اکبر معصوم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ غزل کہتے ہیں۔ چند ایک مشاعروں میں ان کا کلام سنا ہے۔ خوب کہتے ہیں۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

استعارے بدلتے رہتے ہیں رخ ستارے بدلتے رہتے ہیں
صرف موسم کا ہی تو دوش نہیں اب تو سارے بدلتے رہتے ہیں
اشکِ دریا کے دو کنارے ہیں اور کنارے بدلتے رہتے ہیں
عشق نے رنگ دیا ہے جب سے رنگ ہمارے بدلتے رہتے ہیں

غم کا منتقل وہی پرانا ہے
غم کے مارے بدلتے رہتے ہیں

غزل نمبر ۲:

جب کوئی غم نہیں رہا دل میں تو کوئی دم نہیں رہا دل میں
چھا گئی ہے عجیب خاموشی شور یک دم نہیں رہا دل میں
دل کی آب و ہوا ہی ایسی ہے جو رہا کم نہیں رہا دل میں
عشق میں پہلے اک جنوں سا تھا اب وہ جانم نہیں رہا دل میں

تیرے آنے کی ہے خوشی لیکن
اب وہ عالم نہیں رہا دل میں

☆☆☆

غلام مصطفیٰ رازؔ

۲۳ر جنوری ۱۹۷۹ء کو سانگھڑ میں پیدا ہوئے۔ سوشالاجی میں ایم اے کیا۔ آج کل ایک این۔جی۔او میں فیلڈ سروس سپروائزر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں شہر میں فروغ شعروادب کے لیے کوشاں ہیں۔ حلقہ سفیرانِ ادب کے بانی چیئرمین ہیں اور ایک کل سندھ مشاعرہ منعقد کر چکے ہیں۔

شاعری سے فطری لگاؤ ہے۔ موزوں طبیعت پائی ہے۔ غزل کہتے ہیں اور چھوٹی بحروں میں عمدہ شعر نکالتے ہیں۔ اشعار میں سلاست، روانی اور بے ساختگی ہے۔ اکثر غزلیں سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہیں۔ وارفتہ مزاج ہیں، طبیعت کی اس وارفتگی نے کلام کو کیف وجذب کا مرقع بنادیا ہے۔

رازؔ کا اوّلین مجموعہ کلام "منظر بدلنے والا ہے" ۲۰۱۰ء میں منصۂ شہود پر آکر ان کی شناخت کا مضبوط حوالہ بن چکا ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

غم کو سینے میں پال رکھا ہے　دل کو مشکل میں ڈال رکھا ہے
کیا خبر کب وہ مانگ لے مجھ کو　میں نے خود کو سنبھال رکھا ہے
اس کی یادوں نے ایک عرصے سے　مجھ پہ سایا سا ڈال رکھا ہے
ساری چیزیں نکال کر دل سے　بس تمہارا خیال رکھا ہے
اپنے اندر اُسے بٹھا کر رازؔ
خود کو باہر نکال رکھا ہے

غزل نمبر ۲:

وقت اب یوں گذارا جاتا ہے　جیسے پانی کا دھارا جاتا ہے
کوئی خوش ہے کہ اس کی جیت ہوئی　کوئی خوش ہے کہ ہارا جاتا ہے
عشق میں دل کو جس کا خوف رہے　وہ بھی لمحہ گذارا جاتا ہے
کاش وہ آئیں تو دکھائیں ہم　کس طرح گھر سنوارا جاتا ہے
فائدہ عشق میں کچھ ایسا ہے　عمر بھر کا خسارا جاتا ہے
دیکھیے آج شام مقتل میں　نامؔ کس کا پکارا جاتا ہے
عشق جنگل ہی رازؔ ہے ایسا
جو بھی جائے وہ مارا جاتا ہے

☆☆☆

غلام مرتضیٰ چشتی

یکم فروری ۱۹۸۶ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ ذاتی کاروبار کرتے ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں انٹر کی تعلیم کے دوران مجھ سے ملے اور ادب میں دل چسپی ظاہر کی ان دنوں، میں بچوں کے لیے ماہنامہ رسالہ "الماس" نکالتا تھا۔ موصوف اکثر شام میں میرے پاس آکر بیٹھتے اور مطالعے کے لیے کتابیں بھی لے جاتے۔ ۲۰۰۹ء میں انہوں نے شاعری میں دل چسپی ظاہر کی چناں چہ حلقہ یارانِ سخن کے تحت ۲۲/ مارچ ۲۰۰۹ء کو ہونے والے محفل مشاعرے کی ابتداء میں انہیں پڑھایا گیا، اس مشاعرے میں کراچی سے جاوید منظر، عارف شفیق، اختر سعیدی، عاصم صدیقی اور حیدر حسنین جلیسی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرے کے چند روز بعد ہی موصوف نے ایک الگ ادبی تنظیم قائم کر لی اور جاوید منظر کے تعاون سے ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی، اس میں میرا بائیکاٹ کیا گیا۔ موصوف نے جاوید منظر کی سرپرستی اور کامران عشرت کی معاونت میں ایک رسالہ "گردش" بھی شائع کیا جس کا ایک ہی شمارہ سامنے آسکا۔

نمونہ کلام

غزل:

یار کی جو نظر نہیں ہوتی زندگی پھر بسر نہیں ہوتی
کر گزرتا میں کچھ نہ کچھ شاید یہ محبت اگر نہیں ہوتی
ہو ضرورت بہت مجھے جس کی چیز وہ میرے گھر نہیں ہوتی
عیب سب کے میں دیکھ لیتا ہوں میری خود پہ نظر نہیں ہوتی
یاد کوئی تو بات آئی تھی آنکھ یوں ہی تو تر نہیں ہوتی

زندگی کے لیے ضروری ہے
پیار بن یہ بسر نہیں ہوتی

☆☆☆

فاروق وفاؔ

محمد فاروق نام اور وفاؔ تخلص، ۳۰ جولائی ۱۹۷۱ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ بی۔ٹیک اور ڈی۔اے۔ای کرنے کے بعد سے مختلف پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازم ہیں۔ پہلے کچھ عرصہ ڈاؤلینس حیدرآباد سے منسلک رہے، آج کل کراچی کی کسی فرم میں اہم ذمہ داریوں پر فائز ہیں۔ خاندان ٹنڈو آدم ہی میں آباد ہے۔ ہفتہ دس دن میں خاموشی سے ٹنڈو آدم ہو کر چلے جاتے ہیں۔ باوجود کوشش کے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ البتہ ماضی میں چند ایک بار ملاقات ہوئی ہے۔ کلام دست یاب نہیں ہو سکا۔ صرف تین اشعار جو ان کے ایک قریبی دوست سے ملے ہیں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

نمونہ کلام

ہم نے اپنے عشق کا یوں بول بالا کر دیا
دل کو اپنے روشنی کا اک حوالہ کر دیا

اپنے بچوں کو سرِ بازار دیکھو بیچ کر
ہو رہا ہے خوش کہ اپنے گھر اجالا کر دیا

عزم و ہمت کو ترے میں پیش کرتا ہوں سلام
نام تو نے ملک و ملت کا حوالہ کر دیا

☆☆☆

کامران عشرت

محمد کامران عشرت ۱۱ر ستمبر ۱۹۷۹ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے، میٹرک کے بعد ذاتی کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔

کتب بینی اور موسیقی کا شوق بچپن سے ہے۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا اچھا خاصا مطالعہ کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو کے تقریباً تمام غزل گائیک ان کی پسند ٹھہرے ہیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں آڈیو کیسٹس جمع کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل عمری میں شعری فہمی کا ذوق پیدا ہوا۔ ۱۹۹۷ء سے شعر کہتے آ رہے ہیں۔ اس وقت سے مجھ سے دوستانہ مراسم ہیں۔ حلقۂ یارانِ سخن اور نیو علی گڑھ کالج کے مشاعروں کا حصہ رہے ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں ایک شعری نشست اپنے گھر کی چھت پر بھی منعقد کر چکے ہیں جس میں میرپور خاص سے مرزا عاصی اختر بطور مہمان شریک ہوئے تھے۔

ٹنڈو آدم سے ۱۲ صفحات کا ایک ادبی کیلنڈر بھی شائع کیا جسے ادبی حلقوں میں پسندی کی نظر سے دیکھا گیا۔ مدیر کی حیثیت سے ۲۰۱۰ء میں ایک رسالہ ''گردش'' شائع کیا۔

ابتداء میں ارشد جالندھری اور مظفر ادیب کی محفلوں میں بھی جایا کرتے تھے۔ ارشد جالندھری سے کچھ عرصہ کلام پر اصلاح بھی لی بعد ازاں اڈیرولعل کے ذودگو شاعر امین اڈیرائی اور پھر مجھ سے رجوع ہوئے۔ غزل کے دلدادہ ہیں۔ چھوٹی بحروں میں اچھا کہتے ہیں۔ اوّلین مجموعہ کلام زیرِ ترتیب ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

ایک ایسا سفر کیا میں نے راستے ہی کو گھر کیا میں نے
دیکھ کر تلخیاں زمانے کی زیست کو مختصر کیا میں نے
عیب اس کے گنانے سے پہلے خود کو پیشِ نظر کیا میں نے
جو نظر مجھ کو رائیگاں آیا
کام وہ عمر بھر کیا میں نے

غزل نمبر ۲:

حالتِ بے گھری میں زندہ ہے آدمی بے بسی میں زندہ ہے
کب سنائی وہ دنیا کو دے گی چیخ جو خامشی میں زندہ ہے
دوستی میں جو مر چلا تھا تیری اب تری دشمنی میں زندہ ہے
یہ محبت، خلوص اور وفا اب کہاں آدمی میں زندہ ہے
بجھ سکے گی کبھی نہ وہ عشرتؔ
آگ جو آگہی میں زندہ ہے

☆☆☆

لیاقت علی تیر

۱۹۳۰ء میں ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ جوہر سعیدی کے چھوٹے بھائی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد خاندان کے ساتھ ٹنڈوآدم آئے۔ بعدازاں ۱۹۵۹ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ جہاں ۱۹۹۳ء کو انتقال ہوا۔

ٹونک کی ادبی فضا میں ذوق شعر گوئی پروان چڑھا اور دسعیدی اور جوہر سعیدی سے اصلاح لی۔ غزل کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔

نمونہ کلام

غزل:

اُن سے بے مہریٔ پیہم کی شکایت کرنا — میرے نزدیک ہے توہینِ محبت کرنا
ہم وفاؤں کا صلہ چاہنے والوں میں نہیں — تم جفاؤں پہ نہ اظہار ندامت کرنا
لب کشائی کی سزائیں مجھے دینے والو! — کیا کوئی جرم ہے اظہارِ حقیقت کرنا
ہم محبت کے تقاضوں کو کریں گے پورا — ہم کو آتا ہے اصولوں سے بغاوت کرنا
میرے جذبات محبت کی پذیرائی ہے — آپ کا پُرسشِ احوال کی زحمت کرنا
ہے کٹھن جادۂ اخلاص و محبت لوگو — تم ذرا سوچ کے پیمانِ محبت کرنا

توڑ کر نفرت و وحشت کا فسوں اے تیرؔ
ہم زمانے کو سکھائیں گے محبت کرنا

☆☆☆

محمد علی تبسم

۱۵ جون ۱۹۶۰ء نواب شاہ میں پیدا ہوئے۔ موزوں طبیعت پائی۔ غزل کہنے لگے۔ نواب شاہ میں احمد ضیاء اور نسیم شناس کاظمی سے تعلق پیدا ہوا جو مشاعروں میں شرکت کا سبب بنا۔

... کا ایک عرصہ ایسا گزرا جب ادبی محفلوں اور مشاعروں سے نشست و برخاست نے فکر تلاشِ معاش سے بیگانہ رکھا۔ مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں کلام چھپنے لگا۔

محمد علی تبسم ۲۰ سال سے ٹنڈو آدم میں مقیم ہیں اور ماضی کے برعکس ادبی حلقوں سے دور بالکل گوشہ نشینی والی زندگی گزار رہے ہیں۔ گویا فکرِ معاش نے شاعری سے بیگانہ کر دیا۔

چند برس قبل ایک نجی محفل میں ان سے تعارف ہوا۔ کلام سنا دل خوش ہوا۔ سہلِ ممتنع میں بڑے سلیقے سے شعر کہتے ہیں۔ میری درخواست پر حلقۂ یارانِ سخن کی رکنیت قبول کی اور مشاعروں میں آنے لگے۔

غزل کے علاوہ حمد، نعت، سلام، منقبت اور نظم کہتے ہیں۔ مجموعہ کلام منتظرِ اشاعت ہے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

کبھی تو دیکھ آشفتہ سروں کو چلے ہیں اپنے گھروں سے جنگلوں کو
جوانی میں کیا ہے خون دل کا سُلا کر میں نے اپنی خواہشوں کو
نہ جائے چھوڑ کر مجھ کو اکیلا اگر سُن لے تو دل کی دھڑکنوں کو
کبھی آکر تو میرے پاس بیٹھو ترستا ہوں تمہاری قربتوں کو

تبسم پیار کے دو بول اکثر
گھٹا دیتے ہیں دل کے فاصلوں کو

غزل نمبر ۲:

مَس جو گل سے صبا نہیں ہوتی گل سے خوشبو جدا نہیں ہوتی
اس ہوتا نہیں ہر اک دل میں ہر نظر میں حیا نہیں ہوتی
مسکراتے حسین پھولوں کی کس کے دل میں جگہ نہیں ہوتی
جانتے ہیں کبھی بُرا اچھا بھول کر ہر خطا نہیں ہوتی
زندگی بلبلہ ہے پانی کا زندگی دیرپا نہیں ہوتی

جس میں ساماں نہ ہو برسنے کا
وہ تبسم گھٹا نہیں ہوتی

☆☆☆

مسعود الرحمٰن

۱۲ر جنوری ۱۹۶۷ء کو میر پور خاص سندھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان جودھپور (بھارت) سے ہجرت کر کے میر پور خاص میں قیام پذیر ہُوا۔ پہلے دادا اور بعد میں ان کے والد عبدالرحمٰن ریلوے میں ملازم ہوئے۔ چناں چہ مختلف شہروں میں عارضی قیام رہا۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۵ء تک ٹنڈو آدم میں رہے بعد ازاں حیدرآباد منتقل ہو گئے۔

مسعود الرحمٰن نے گورنمنٹ سرسید ہائی اسکول ٹنڈو آدم سے میٹرک اور گورنمنٹ نیو علی گڑھ کالج ٹنڈو آدم سے انٹر کیا۔ بعد ازاں سندھ یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کر کے ۲۰۰۰ء میں محکمۂ تعلیم میں لیکچرر ہو گئے۔ آج کل گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد میں تعینات ہیں۔

۱۹۸۲ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ٹنڈو آدم میں قیام کے دنوں میں "انجم" تخلص کرتے تھے اور غالب کی نسبت سے "غالبی" لکھتے تھے۔ بعد ازاں رئیس امروہوی اور جون ایلیا معیار ٹھہرے۔

غزل ان کی مرغوب صنف ہے۔ تاہم نعت اور نظم بھی کہتے ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شعری مجموعہ ابھی تک سامنے نہیں آیا تاہم ان کا ایم۔ اے کا مقالہ "رئیس امروہوی۔ شخص و شاعر" ۱۹۹۳ء میں شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

معرکہ ہائے شب و روز میں ہارا ہوا دل
جائے تو جائے کہاں وقت کا مارا ہوا دل

اکثر صحبتِ مہتاب نہیں تو کیا ہے
ایک ہی شب میں شرارے سے ستارا ہوا دل

کٹ گئی کشمکشِ ثبت و نفی میں عمر
ہو سکے دل کے کبھی ہم، نہ ہمارا ہوا دل

تاج داروں کا قصیدہ تو نہیں لکھ سکتا
حسنِ خوباں زمانہ پہ اُتارا ہوا دل

راس آئی ہمیں مفلسی و محرومی
اسی درویشی میں اسکندر و دارا ہوا دل

کام آتا ہے مثالِ خضرِ راہ یہاں
تجرباتِ غمِ ہستی سے گزارا ہوا دل

غزل نمبر ۲:

ترشی عام کا نہیں رکھا
خود کو اس کام کا نہیں رکھا

ہمق رفتاری زماں نے ہمیں
سحر و شام کا نہیں رکھا

قطع جب سے ہوئے مراسم دل
کارڈ تک نام کا نہیں رکھا

غم نے ہنگامۂ حیات کے بیچ
لمحہ آرام کا نہیں رکھا

بنگان خیال و خواب کو تو
دانہ و دام کا نہیں رکھا

درد سر ہم مسافروں نے کبھی
کام دو کام کا نہیں رکھا

دل نے بعد از خرابیِ بسیار
کشف و الہام کا نہیں رکھا

☆☆☆

محمد موسیٰ ملک

۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء تک کیڈٹ کالج سانگھڑ میں ایڈجوٹنٹ کے طور پر تعینات رہے۔ ۱۹۹۷ء میں جب میں وہاں لیکچرر ہو کر گیا تو ان کا تبادلہ آچکا تھا۔ ایک دو ہفتوں کا ساتھ رہا اس دوران ان سے ادب پر سرسری گفتگو رہی۔ یہ انکشاف ان کے جانے کے بعد ہوا کہ موصوف ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور باقاعدہ شعر کہتے ہیں۔ ان دنوں پاکستان نیول ہیڈکوارٹر میں تقرری ہے۔

نمونۂ کلام

غزل:

تم سے مل کر کتنا خوش ہوں — بھول گیا ہوں دکھ کے پھیرے
اب تو یہ بھی یاد نہیں ہے — خون ہوا تھا دل کا میرے
اچھے دن پھر لوٹ آئے ہیں — خوشیاں برسیں شام سویرے
تم نے حال بدل ڈالا ہے — تم نے چاک سیے ہیں میرے
کتنی آسانی سے جاناں — کندہ ہوئے ہو دل پہ میرے

تنہائی کے دہر میں تم نے
شمعیں، جگنو، دیپ بکھیرے

☆☆☆

میراںؔ شہاب

سجادہ نشین دائرہ مہدویہ پیر سید میراں شہاب یداللّٰہی ۴؍ جنوری ۱۹۶۳ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید شہاب الدین اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں دائرہ مہدویہ کی ذیلی تنظیم "بزم ادب" کے تحت شہداد پور میں شعر و ادب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی ادبی ماحول میں میراں شہاب کی پرورش ہوئی۔

۱۹۹۸ء میں، سجادہ نشین کی خلعت پہننے کے بعد پیر میراں شہاب نے بزم ادب کو دوبارہ سے فعال کیا اور تواتر کے ساتھ مشاعروں کا انعقاد کیا لیکن یہ سلسلہ چند برس قبل تک جاری رہنے کے بعد ایک بار پھر تعطل کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ میراں شہاب شہر کی متعدد سماجی و فلاحی تنظیموں میں اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، خاص طور پر تعلیم و صحت کے شعبوں میں بڑی تندہی کے ساتھ مشغول عمل ہیں۔

میراں شہاب نے شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز نوّے کی دہائی میں کیا اور فاضل حیدی کے حلقۂ تلمذ میں رہے۔ غزل ذریعۂ اظہار ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

ہم تھے امین عہدِ وفا جاگتے رہے
دنیا کا اعتبار نہ تھا جاگتے رہے

تاریکیوں نے گھیر لیا تھا حیات کو
شب بھر جلا کے دل کا دیا جاگتے رہے

آئے اگر سحر تو اندھیرا کہیں نہ ہو
جب تک یہ فیصلہ نہ ہوا جاگتے رہے

انسان نکل گئے تھے بغاوت پہ رات کو
کل شہر کے تمام خدا جاگتے رہے

سویا تھا تھکن سے کہ میرے پاس کچھ نہ تھا
سب کارواں میں، میرے سوا جاگتے رہے

کل رات ہم نے توڑ دیے خواہشوں کے بت
جب تک یہ زہر پی نہ لیا جاگتے رہے

ہے جس گلی میں جنبشِ دیر و حرم شہابؔ
ہم تھے اسی گلی میں سدا جاگتے رہے

غزل نمبر ۲:

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
خلافت دے کے بہلایا گیا ہوں

زمانے کو میں کیا سمجھا سکوں گا
کہ میں تو خود ہی سمجھایا گیا ہوں

مجھے جنت کی اب حاجت نہیں ہے
کہ جنت ہی سے تو لایا گیا ہوں

ابھی آیا ہوں آخر کیا ہے جلدی
کہ میں تو آج کھنکایا گیا ہوں

میرے ہی واسطے دنیا بنی ہے
لہٰذا میں ہی دنیایا گیا ہوں

☆☆☆

۵ اپریل ۱۹۸۲ء کو شہداد پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پروفیسر گل محمد گلانی گورنمنٹ ڈگری کالج شہداد پور کے پرنسپل رہے ہیں، جب کہ بڑی بہن رفیعہ گلانی سماجی وفلاحی اور انسانی حقوق کی مختلف ملکی اور بین الاقوامی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ ندیم گلانی نے اپنے والد اور بڑی بہن کی سرپرستی میں علمی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مختلف تقاریب کے انعقاد سے شہری سطح پر ابھر کر سامنے آئے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد سے بطور شاعر مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔

ندیم گلانی نے مختلف شعرا کی غزلوں اور نظموں کے تین انتخاب شائع کیے، جب کہ ان کے دو شعری مجموعے "محبت" اور "مجھے تنہائی ڈستی ہے" شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام

غزل:

تری قربتیں ہیں سکوں جانِ جاناں ۔ وگرنہ محبت جنوں جانِ جاناں

ابھی تک گھنیری سی چادر میں ہوں میں ۔ کسی زلف کا ہے فسوں جانِ جاناں

دکھوں سے بھری زندگی میں اکیلا ۔ مجھے تم نے چھوڑا ہے کیوں جانِ جاناں

خریدار تو ہو تو خواہش ہے میری ۔ کہ یوسف کی طرح بکوں جانِ جاناں

زمانہ تو کہتا ہے کہتا رہے گا ۔ یہ یوں ہے یہ یوں ہے یہ یوں جانِ جاناں

نظم (محبت کی مٹی):

ہم جیسے دیوانوں پر
سردیوں کی خوشبو بھی
بجلیاں گراتی ہے
سردی اور محبت کا
اک عجب تعلق ہے
شاید محبت کی مٹی
اس نے اپنے ہاتھوں سے
سردیوں میں گوندھی ہے

☆☆☆

نعمان رفیق چودھری

۱۷ر جنوری ۱۹۷۲ء کو فیصل آباد کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ڈویژنل پبلک اسکول فیصل آباد سے حصول تعلیم کے بعد ۱۹۸۷ء میں پاک بحریہ میں چلے گئے۔ نیول اکیڈمی کا تربیتی امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم و تربیت کے لیے نیول اکیڈمی اینا پلس، میری لینڈ امریکا بھیج دیے گئے جہاں سے ۱۹۹۵ء میں پی این ایس ٹیپو سلطان میں واپسی ہوئی۔ ۱۹۹۶ء میں ایس وی بحریا اور جولائی ۱۹۹۷ء میں بطور ایڈ جوٹنٹ کیڈٹ کالج سانگھڑ میں تبادلہ ہوا۔ ان دنوں، میں بھی بطور لیکچرر اس کالج سے وابستہ تھا۔

اگست ۱۹۹۸ء میں نعمان نے PWO (پرنسپل وار فائر آفیسر) کا کورس کرنے کراچی چلے گئے جس کی تکمیل کے بعد پی این ایس بہادر اور پی این ایس طارق پر ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ۲۰۰۵ء میں پی این وار کالج سے گریجویشن کیا، بعد ازاں اعلا تعلیم و تربیت کے لیے یو ایس نیول وار کالج کے لیے منتخب ہوئے۔ وہ کچھ عرصہ بحرین میں نویں بحری اسکواڈرن کا ... بھی رہے اور بحری قزاقوں کے خلاف کثیر الملکی افواج کے اتحاد میں پاکستان فلیٹ میں خدمات انجام دیں۔ آج کل نیول ہیڈ کوارٹر میں تعینات ہیں۔

نعمان کے والد پروفیسر محمد رفیق چودھری، پنجاب یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ وہ اگرچہ تاریخ کے پروفیسر تھے تاہم سیاسیات اور اسلامک اسٹڈیز کے مضامین بھی پڑھاتے تھے۔ ان مضامین پر ان کی چند ایک تصانیف مختلف یونی ورسٹیز کے نصاب کا حصہ ہیں۔ چودھری صاحب اعلا ادبی ذوق کے حامل ہیں اور فردوسی، حافظ شیرازی اور اقبال سے حد درجہ متاثر ہیں۔ نعمان اپنے والد کی معرفت ادب کی جانب راغب ہوئے تاہم والد کے برعکس غالب اور فیض ان کا معیار ٹھہرے۔ وہ دیوانِ غالب کے "دیوانے" اور نسخہ ہائے وفا کے "مریض" ہیں۔

کیڈٹ کالج سانگھڑ میں تعیناتی کے دنوں میں نعمان سے اچھا خاصا یارانہ رہا۔ ان دنوں میری درخواست پر انھوں نے ٹنڈو آدم کے ایک دو مشاعروں میں اپنا کلام بھی سنایا۔ جن میں سے ایک مشاعرے میں کراچی سے اختر سعیدی بھی شریک ہوئے تھے۔

ابتدا میں نعمان، انگریزی میں نظمیں لکھتے تھے پھر اردو غزل کی طرف مائل ہو گئے۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

تعریف سن کے تیری اٹھ آیا میکدے سے
تھا گفتگوئے رنداں میں رنگ عامیانہ

وحشت فراق میں تھا ابرِ بہار مجھ کو
مژگانِ چشمِ تر کا ہے دام شامیانہ

ماہِ تمام کے بن کٹتی نہ ہجر کی شب
کرتا رہا میں اُس کا دیدار غائبانہ

دلدار ہے تو اس میں ہوگی جفا کی خو بھی
گر ہے صنم تو لازم انداز کافرانہ

نعمان کوہ کن سا مجھ کو جنوں عطا ہو
تو جوئے شیر لاتا ہے کھیل بچگانہ

غزل نمبر ۲:

دل ملامت پسند ہے میرا
جبر میں ہے نہ اختیار میں ہے

اک نظرہ ہے اسیر حسن طلب
اک سحر ہے جو حسنِ یار میں ہے

کچھ نہ کہہ کر بھی مدعا کہنا
کیفیت یہ بھی ایک پیار میں ہے

تھی کبھی دل میں اک خلش و جنوں
اب گریباں کے تار تار میں ہے

پھر ہو بارش بخیر اس سے سخن
ذوقِ گفتار انتظار میں ہے

غزل نمبر ۳:

جو بحر پیمائی شغل ٹھہرا تو فکر کیا ہے کدھر کنارا
کہ ہم سفریاں ہے موجِ دریا تو رہنما ہے قطب ستارہ

اوائلِ عشق میں تو صحرا نوردیوں کا نشہ عجب تھا
کہ سنگِ منزل کو دیکھ کر بھی نہیں تھا رکنا ہمیں گوارا

ہمیں کو پینے دو زہر ساقی کہ ظرف اتنا کہاں ہے سب میں
کنارہ ساغر سے لب لے تو سنگ اُٹھے گا بدن تمہارا

کمال کی تھی وہ تیرگی جو ہر ایک شے میں سما چکی تھی
کسی سحر کو کسی بھی سورج کو روشنی کا نہیں تھا یارا

یہ بانکپن تم سنبھال رکھو بچا کے رکھو جمال اپنا
کہ سچائی وہ آ لے گی، کیا فلک نے جو اک اشارہ

وارث اقبال

سید وارث اقبال علوی ۸ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان کے شہر بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا عبداللہ ندوی[1] قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے ٹنڈوآدم میں مقیم ہوئے۔

وارث اقبال لڑکپن سے شعری ذوق رکھتے تھے۔ ان کے والد کی جگر مرادآبادی سے دوستی تھی چناں چہ جگر صاحب کو کلام دکھانے لگے۔ قیام پاکستان تک اچھا خاصہ کلام کہہ چکے تھے لیکن ہجرت کے دوران ضایع ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں سندھ یونی ورسٹی میں، شعبہ انگریزی میں ایم اے کے دوران ذوق شعر گوئی نے پھر انگڑائی لی اور دوبارہ شعر کہنے لگے۔

ایم اے کے بعد اسی یونی ورسٹی میں لیکچرر مقرر ہو گئے، کچھ عرصہ اعلا تعلیم کے لیے برطانیہ میں قیام رہا۔ چند ایک دیگر ملکوں کی جامعات میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ غیر ملکی زبانیں بھی سیکھیں لیکن وہاں دل نہ لگا۔ واپس وطن لوٹے اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے توسط سے جامعہ بلوچستان میں پروفیسر ہو گئے جہاں سے ۸ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو مدت ملازمت کی تکمیل کے بعد کراچی آ گئے اور ۹ دسمبر ۲۰۱۳ء کو رحلت فرمائی۔

دسمبر ۱۹۹۲ء میں، مجموعہ کلام "نئی صورتیں" منظر عام پر آیا جو ان کے احساسات و جذبات کا آئینہ دار ہے۔ یہ مجموعہ مجھے ٹنڈوآدم کے مرد آزاد، "ڈاکٹر" یوسف آزاد کے توسط سے دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔

---

[1] مولانا عبداللہ ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید تھے۔ اسی نسبت سے ندوی لکھتے تھے۔ ٹنڈوآدم کی جامع مسجد کے قیام سے قبل اس کے احاطے میں مدرسہ ندوۃ العلوم کی بنیاد رکھی جس کے لیے ان کی دعوت پر سید سلیمان ندوی ٹنڈوآدم تشریف لائے اور تاریخی خطبہ دیا۔ پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔ بمبئی بازار میں اپنے گھر کے ایک حصے میں مطب قائم کیا ہوا تھا۔ آخری عمر میں خاندان کے ہمراہ حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے جہاں ۱۹۸۰ء میں انتقال ہوا۔

نمونہ کلام

غزل نمبر ۱:

پردۂ اسرار کچھ کھلتا نہیں اے دلِ بے زار کچھ کھلتا نہیں
ذہن اک ظلمت کدے میں ہے اسیر عقل کا معیار کچھ کھلتا نہیں
شاہراہیں سب لہو آشام ہیں حاصلِ پیکار کچھ کھلتا نہیں
دل میں اک اندازۂ غم ہے کہیں مخزنِ آزار کچھ کھلتا نہیں
ساعتیں محرومیوں کے ساتھ ہیں گردشِ ادوار کچھ کھلتا نہیں
ہم بھی ہیں اپنی روش پہ کاربند
اس کا بھی کردار کچھ کھلتا نہیں

غزل نمبر ۲:

جیسے صدیوں کا بار دل پہ تھا ایک ایسا غبار دل پہ تھا
مدتوں تک تھا مجھ بے تابی جانے کیسا بخار دل پہ تھا
نقش تھا ایک جیسے گہرا اک نشاں آر پار دل پہ تھا
زندگی اور غم کے سایوں کا رابطہ بے شمار دل پہ تھا
ذکر تھا دوستوں کا اور میرے مستقل انتشار دل پہ تھا
ہر گھڑی تھیں اذیتیں کتنی
کتنا غم بار بار دل پہ تھا

☆☆☆

یاسمین زاہد

۲۲ مئی ۱۹۶۸ء کو پنجاب کے شہر لیہ میں پیدا ہوئیں۔ ایم۔ اے اردو کیا اور ۱۹۸۹ء کو شادی ہو کر ٹنڈو آدم آ گئیں۔

موصوف کے بقول بارہ سال کی عمر سے شعر کہتی آ رہی ہیں اور کالج کے زمانے میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت متحرک رہی ہیں تاہم ٹنڈو آدم قیام کے دوران ایک عرصے تک ادبی منظر نامے سے غائب رہیں۔ اس دوران ان کا اولین شعری مجموعہ "پہلی محبت" لاہور سے شائع ہوا۔

حلقۂ یارانِ سخن کے دوسرے سالانہ کل پاکستان مشاعرے (منعقدہ ۲۰۱۰ء) کی خبر اخبار میں پڑھ کر رابطے میں آ گئیں اور مشاعرے میں کلام پڑھا۔ بعد ازاں حلقۂ یارانِ سخن کے تحت ان کی کتاب کی تقریبِ پذیرائی کا اہتمام کیا گیا جس میں کراچی سے فاضل جمیلی، راشد نور اور جاوید صبا شریک ہوئے۔ ادبی دنیا میں یاسمین زاہد کا یہ پہلا تعارف تھا جو خوشبو کی طرح چاروں اور پھیل گیا۔ آج کل کراچی میں یاسمین اختر سے کلام پر اصلاح لیتی ہیں اور انہیں باقاعدہ استاد تسلیم کرتی ہیں۔ بقول ان کے، ان کا دوسرا مجموعہ کلام "مجھے اظہار کرنا ہے" ترتیب کے مراحل میں ہے۔

نمونۂ کلام

غزل نمبر ۱:

دل کے جذبات بھی اشک میں ڈھل جاتے ہیں
ہم ترے شہر سے جب دور نکل جاتے ہیں

بات سچی ہے مگر آپ کو حیرت ہوگی
عشق کے دیپ ہواؤں میں بھی جل جاتے ہیں

خود کو تہذیب کی مسند پہ بٹھانے والے
دیکھتے دیکھتے کس طرح بدل جاتے ہیں

راہِ ہموار پہ ہر گام بھٹکنے والے
ٹھوکریں کھا کے زمانے کی سنبھل جاتے ہیں

غیر جو دیتے ہیں بھر جاتے ہیں رفتہ رفتہ
زخم اپنوں کے تو ناسور میں ڈھل جاتے ہیں

غزل نمبر ۲:

علاجِ عشق کا آسان تھوڑی ہوتا ہے
ہر ایک درد کا درمان تھوڑی ہوتا ہے

وہ جن کی یاد ہی شاداب دل کو رکھتی ہو
دل ان کے جانے سے ویران تھوڑی ہوتا ہے

بہت ملیں گے یہاں صاحبِ کتاب مگر
ہر ایک صاحبِ دیوان تھوڑی ہوتا ہے

بہت ہی خاص ہوا کرتے ہیں مکیں اس کے
کہ دل میں ہر کوئی مہمان تھوڑی ہوتا ہے

ہر ایک گام کوئی یاد ساتھ چلتی ہے
یہ راستہ بھی سنسان تھوڑی ہوتا ہے

☆☆☆

یونس کھنڈو

یونس شیخ المتخلص بہ کھنڈو، ۱۵ رمئی ۱۹۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ ٹنڈوآدم سے کامرس میں انٹر کرنے کے بعد ذاتی کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔ دو بار عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔ دعوت و تبلیغ دین کے لیے بیرون ملک بھی جا چکے ہیں۔

یونس شیخ کے اندر ایک معصوم سا فنکار چھپا ہوا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے اسٹیج پر اداکاری بھی کی۔ میرے ہم جماعت ہیں۔ میٹرک میں، الوداعی تقریب کے اسٹیج پر ایک مزاحیہ شاعری پیروڈی کر کے خوب داد سمیٹی۔ تاہم گردش ایام نے انہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع نہ دیے۔ شادی کے بعد کئی برس تک غم روزگار میں کبھی کویت تو کبھی کراچی میں سرگرداں رہے۔ پیشے کے اعتبار سے گھڑی ساز ہیں تاہم آج کل ٹنڈوآدم میں حج عمرہ ٹریول ایجنسی سے وابستہ ہیں۔

حلقۂ یاران سخن ٹنڈوآدم کے پہلے کل پاکستان مشاعرے (۲۰۰۹ء) کے بعد شاعری کی جانب راغب ہوئے۔ سنجیدہ، طنز و مزاح اور فرمائشی نظمیں لکھتے ہیں تاہم مشاعروں میں ظریفانہ کلام سناتے ہیں۔

نمونۂ کلام

قطعہ:

ہر طرف ہیں بم دھماکے رات دن
ملک میں کیسی قیامت ہے میاں
ایک قاتل کہہ رہا ہے چیخ کر
یہ شریفوں کی حکومت ہے میاں

غزل:

روکھی سوکھی کھاتے ہیں بیگم گاتے ہیں
تاکا ٹوکی رہتی ہے چھت پہ جب بھی جاتے ہیں
کالے کالے اس کے بھائی مجھ کو روز ڈراتے ہیں
زوجہ پرائی بچے اپنے سب کو ہی کیوں بھاتے ہیں

نظم (نذر امام الدین شوقین):

محبت کا پیکر ہے شوقین صاحب
غریبوں کا رہبر ہے شوقین صاحب
بھلائی کے کاموں میں سب سے ہے آگے
کہ خدمت کا خوگر ہے شوقین صاحب
رقابت کسی سے وہ رکھتا نہیں ہے
ہر اک کا وہ دلبر ہے شوقین صاحب
سیاست بھی کرتا ہے خدمت سمجھ کر
سخاوت میں بڑھ کر ہے شوقین صاحب
سبھی کہہ رہے ہیں کہ فتح تمہاری
تمہارا مقدر ہے شوقین صاحب

☆☆☆

کتابیات

☆ کتب، شعری مجموعے اور تذکرے

۱) اکبر علی لغاری، ڈاکٹر: "کشتی منجھ کنا" حیدرآباد، زیب ادبی مرکز، ۱۹۹۴ء

۲) ضیاء، خورشید علی عزیزی: "دیارِ سخن" شہدادپور، مکتبۂ ادب، سن ندارد

۳) واثق، بدر حسن: "گلزارِ سخن" شہدادپور، ۱۹۷۹ء

۴) عیاں، رحیم صدیقی: "دائرے" کراچی، دائرۂ ادب، ۱۹۸۴ء

۵) عارف المولا: "کلام حسن بخش" حیدرآباد، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۱ء

۶) مشتاق علی جعفری: "سندھ کے جدید اردو شعراء" حیدرآباد، تعمیر سنز، ۱۹۶۱ء

۷) نقوی، نجم حیدر، ڈاکٹر: "دھنک رجگوں کی" کراچی، غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۱ء

۸) نجم نقوی: "معیارِ سخن" شہدادپور، مکتبۂ ادب، سن ندارد

☆ مجلات:

۱) محمد عمران صدیقی: "عکس" سانگھڑ، انجمن فروغِ ادب، ۱۹۸۵ء

۲) فاضل حیدری: "معیرِ ساقی" (حصہ اول) شہدادپور، المشرق آرٹ اکیڈمی، ۱۹۹۱ء

۳) اختر انصاری اکبرآبادی: "نئی قدریں" (جلد، شمارہ نامعلوم) حیدرآباد، ۱۹۷۱ء

☆☆☆